الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خان

لوگ صرف یہ جانتے ہیں کہ ان کو کیا بولنا ہے
مگر عقلمند انسان وہ ہے جو ——————
یہ بھی جانے کہ اس کو کیا بولنا نہیں ہے

شمارہ ۵۵
جون ۱۹۸۱

زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی

قیمت فی پرچہ
دو روپے

الرسالہ

جون ۱۹۸۱

شمارہ ۵۵

جمعیۃ بلڈنگ ، قاسم جان اسٹریٹ ، دھلی ۶ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پروگرام کیا ہے

آپ نے ہم لوگوں کو سخت مصیبت میں ڈال دیا ہے"

" وہ کیا "

" آپ نے اپنی تحریروں کے ذریعہ ہمارے اندر ایک جوش ابھار دیا۔ مگر اس کے آگے ہمیں کوئی پروگرام نہیں دیتے "

اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت ہمارا پروگرام صرف یہ ہے کہ ماہنامہ الرسالہ کی آواز کو عام کیا جائے پہلا کام لوگوں کو باشعور بنانا ہے اور یہ کام صرف الرسالہ کو مسلسل پڑھانے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ الرسالہ کو عام کرنے کی بہترین صورت ایجنسی ہے۔ آپ خود الرسالہ کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ اپنے ماحول میں پھیلائیے۔ عام ایجنٹوں، کتب فروشوں اور بس اسٹینڈ وغیرہ کے بک اسٹالوں کو آمادہ کیجئے کہ وہ اس کی ایجنسی لیں ——— الرسالہ کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایئے، یہی اس وقت ہمارا پروگرام ہے

الرسالہ کے لئے بنک سے رقم بھیجتے ہوئے ڈرافٹ پر صرف الرسالہ منتھلی Al-Risala Monthly لکھیں

موجودہ دنیا ناکافی

گرسن ولوریا (Gerson Viloria) فلپائن کا ایک باشندہ ہے جس کی عمر ۴۳ سال ہے۔ وہ ایک ٹریژری میں کلرک تھا۔ اس نے لوگوں کی طرف سے فرضی دستخط کرکے بہت سے لوگوں کی رقم وصول کرلی۔ اس کا مقدمہ فلپائن کی ایک عدالت میں پیش ہوا۔ جج کا نام رومیو اسکاریل (Romeo M. Escareal) تھا۔ جج نے تفصیلی سماعت کے بعد گرسن ولوریا کو ۷۰ معاملات میں مجرم پایا۔ قانون کے مطابق اس طرح کے ایک جرم میں آدمی کو ۱۰ سال قید بامشقت کی سزا ملنی چاہئے۔ اس کے مطابق جج نے مجرم کو ۷۰۰ سال کی سزادی۔ اسی کے ساتھ اس نے مجرم پر ۴۶۲۵ ڈالر جرمانہ عائد کیا۔ جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں سزائے قید میں اضافہ ہوجائے گا (ٹائمس آف انڈیا ۹ نومبر ۱۹۷۹)

مجرم کی عمر ۴۳ سال ہوچکی ہے۔ اگر "قبل از وقت" اس کا خاتمہ نہ ہو بلکہ وہ اپنی عمر طبعی کو پورا کرکے مرے تب بھی اس کی موت کے وقت اس کی سزا کی مدت میں کم از کم سو سال باقی رہ جائیں گے —— انسان کا ضمیر کسی عمل کا جو بدلہ یا کسی جرم کی جو سزا چاہتا ہے وہ موجودہ محدود دنیا میں ناممکن ہے۔ جو ہونا چاہئے اور جو ہورہا ہے کے درمیان یہ تضاد بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا نامکمل ہے۔ اس کی تکمیل کے لئے ایک اور دنیا ہونی چاہئے جہاں یہ تضاد ختم ہوجائے اور جو کچھ ہونا چاہئے وہی عملاً بھی ہونے لگے۔

اسی قسم کا ایک واقعہ تھائی لینڈ میں ہوا۔ تھائی لینڈ کی ایک عدالت میں ایک خاتون پولس کا مقدمہ پیش ہوا۔ اس کا نام مسز امساپ (Mrs. Phenphanchong Imsap) ہے۔ وہ سرحدی علاقہ پیچابون (Petchabun) میں تعینات تھی۔ اس کا تعلق بیرونی افراد کے رجسٹریشن آفس سے تھا۔ اس نے رجسٹریشن کے نام پر لوگوں کو دھوکا دینا اور ان سے رشوت لینا شروع کیا۔ وہ سترہ سال تک حکومت کو اور اسی کے ساتھ لوگوں کو فریب دیتی رہی۔ اس مدت میں اس نے ناجائز طور پر تقریباً ۲۵ ہزار ڈالر کمایا۔ عدالت نے خاتون پولس کو مجرم قرار دیتے ہوئے اس کو ایک ہزار ایک سال کی قید بامشقت کی سزادی۔ جج نے اپنے فیصلہ میں مزید لکھا کہ مجرم کو پیرول پر رہائی یا رحم کی درخواست کی رعایت نہ دی جائے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو (ٹائمس آف انڈیا ۱۲ مارچ ۱۹۸۱)

ظاہر ہے کہ خاتون پولیس عدالت کی سزا بھگتنے کے لئے مزید ایک ہزار ایک سال تک زندہ نہیں رہے گی۔ وہ یقینی طور پر اس سے بہت پہلے مرجائے گی۔ پھر جج نے کیوں اس کو اتنی لمبی سزادی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کا جذبۂ انصاف چاہتا ہے کہ جو شخص کوئی بڑا جرم کرے اس کو اس کے جرم کے بقدر لمبی سزادی جائے۔ مگر موجودہ دنیا میں کوئی جج عملاً ایسا کر نہیں پاتا۔ وہ مجرم کو "ایک ہزار سال" کی سزا دینا چاہتا ہے مگر آدمی کی محدود عمر اس کو ایسا کرنے نہیں دیتی۔ آدمی کے جرم کی عمر "ایک ہزار سال" ہے اور اس کے جینے کی عمر صرف "پچاس سال"۔ آدمی کے عمل اور اس کی عمر دونوں میں یکسانیت نہیں۔ یہ صورت حال ایک اور وسیع تر دنیا کا تقاضا کرتی ہے جہاں آدمی زیادہ لمبی عمر پائے تاکہ وہ پورے انصاف کے ساتھ اپنے عمل کا انجام پا سکے۔

زندہ رہنمائی

اسلام انسان کے لئے خدا کی ابدی رہنمائی ہے۔ اسلام کی صورت میں خدا نے وہ تمام بنیادی اصول بتا دئے ہیں جو انسان کو موجودہ دنیا کی زندگی میں سچائی اور انصاف پر قائم رکھنے والے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ مزید انتظام کیا گیا ہے کہ رسول اور اصحاب رسول کی زندگیوں کے ذریعہ ان اصولوں کا مکمل عملی نمونہ بھی ایک شاندار تاریخ کی صورت میں ہمارے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ اسلام کی یہ تاریخ ہر موڑ پر ایک زندہ رہنما کی طرح کھڑی ہوئی ہر آدمی کو بتا رہی ہے کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

ایک غریب مسلمان دن بھر کی محنت کے بعد شام کو اپنے گھر واپس آیا۔ اس کو بھوک لگی ہوئی تھی۔ اس کی بیوی کھانا لائی تو وہ صرف ارہر کی دال اور جو کی روٹی تھی۔ مسلمان اس کو دیکھ کر جھنجلا اٹھا کہ دن بھر کی محنت کے بعد ہم کو یہی کھانا ملا ہے اور کتنے لوگ بغیر محنت کے عمدہ عمدہ کھانا کھا رہے ہیں۔ مگر معاً بعد اس کو خیال آیا کہ خدا کے محبوب پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کھانا تو اس سے بھی زیادہ معمولی ہوتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس کے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے۔ انسانوں کے درمیان معاشی اونچ نیچ اس کو اصل مسئلہ کی نسبت سے غیر اہم نظر آنے لگی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنا کھانا کھا لیا اور رات کی نماز پڑھ کر سو گیا۔

دنیا کی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ آدمی چلتے چلتے سیدھے راستہ کے ادھر ادھر بھٹک جاتا ہے۔ وہ اہم اور غیر اہم کے فرق کو بھول جاتا ہے۔ اس کی نظر اصل نشانہ سے ہٹ کر وقتی چیزوں میں الجھ جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر اسلام کی تاریخ آدمی کے لئے ایک معیار کا کام دیتی ہے۔ وہ زندہ نمونوں کے ذریعہ آدمی کی تصحیح کرتی رہتی ہے۔ ایک "عام" آدمی بھی اس میں اپنا سبق پا سکتا ہے اور ایک "خاص" آدمی بھی۔

۳ مئی ۱۹۶۹ کو سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کی اچانک وفات ہوئی تو مسٹر وی وی گری نائب صدر تھے۔ اس کے بعد دستور ہند کے مطابق وہ قائم مقام صدر ہو گئے۔ تاہم جلد ہی انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے عہدہ سے استعفا دے دیں اور صدارتی الکشن کا مقابلہ کریں۔ ان کے استعفا کے بعد جو قانونی صورت پیدا ہوئی اس کے مطابق جناب محمد ہدایت اللہ (پیدائش ۱۹۰۵) ہندستان کے ایکٹنگ صدر مقرر ہوئے جو اس وقت ہندستانی سپریم کوٹ کے چیف جسٹس تھے۔ ان کی صدارت ۳۵ دن (۲۰ جولائی تا ۲۴ اگست ۱۹۶۹) جاری رہی۔

دنیا کی سب سے بڑی جمہوریہ کے صدر کی حیثیت سے جناب محمد ہدایت صاحب کو جو تجربات ہوئے ان کو انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری (My Own Boswell) میں درج کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ بڑا سبق آموز ہے۔

۱۵ اگست ۱۹۶۹ کو راشٹرپتی بھون کے مغل گارڈن میں یوم آزادی کی تقریب تھی۔ محمد ہدایت اللہ صاحب بحیثیت صدر روایتی جلوس کے ساتھ راشٹرپتی بھون سے نکلے۔ اعلیٰ فوجی افسران، اے ڈی سی کا عملہ، صدارتی باڈی گارڈ سب جلوس میں چل رہے تھے۔ ان کا پرشوکت یونیفارم اور منظم انداز میں حرکت کرنا راشٹرپتی بھون کے شاہانہ ماحول میں عجیب شان دار منظر پیش کر رہا تھا۔ محمد ہدایت اللہ صاحب کہتے ہیں کہ اپنے گرد یہ شان و شوکت دیکھ کر مجھے کسی قدر فخر کا احساس ہونے لگا:

I felt a little pride (P.245)

مگر اگلے ہی لمحہ ان کو فاروق اعظم رضؓ کا وہ واقعہ یاد آگیا جو کسی قدر فرق کے ساتھ تاریخ کی مختلف کتابوں میں آیا ہے۔

شام و فلسطین کی جنگ کے آخری مرحلہ میں عیسائیوں نے پیش کش کی کہ وہ ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ خلیفہ اسلام خود سفر کر کے یہاں آئیں۔ خلیفہ دوم ایک اونٹ اور ایک غلام کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے۔ دمشق کے قریب جابیہ کے مقام پر پہنچے تو ابو عبیدہ بن الجراح اور خالد بن ولید اور اسلامی فوج کے دوسرے سرداروں نے آپ کا استقبال کیا۔ جابیہ میں کئی دن تک قیام رہا اور عیسائیوں سے گفتگو کے بعد یہیں معاہدہ لکھا گیا۔

معاہدہ کی تکمیل کے بعد عمر فاروق رضؓ بیت المقدس کے لئے روانہ ہوئے۔ آپ کے جسم پر پرانے نہایت معمولی کپڑے تھے۔ آپ کی سواری ایک دبلی اونٹنی تھی۔ چنانچہ لوگوں نے آپ کی خدمت میں نیا کپڑا اور ترکی نسل کا عمدہ گھوڑا پیش کیا اور اصرار کیا کہ آپ اونٹنی کو چھوڑ دیں اور اسی گھوڑے پر سفر کر کے جائیں۔ آپ گھوڑے پر سوار ہوئے تو وہ عجیب شان کے ساتھ چلنے لگا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد عمر فاروق رضؓ گھوڑے سے اتر گئے اور کہا کہ میری اونٹنی لاؤ، میں اسی پر سوار ہو کر جاؤں گا۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو کہا: میرے دل میں بڑائی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی بڑائی کا جذبہ ہو وہ جنت میں نہیں جائے گا۔

محمد ہدایت اللہ صاحب کو جب یہ واقعہ یاد آیا تو ان کے دل کی کیفیت بدل گئی۔ اس وقت ان کا جو حال ہوا اس کو وہ ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں ——— مجھے اپنے اوپر شرم آنے لگی۔ میں نے اسی وقت اس احساس کو اپنے اندر سے نکال دیا اور دوسری چیزوں کے بارے میں سوچنے لگا:

I felt ashamed of myself and put aside the feeling at once and begun thinking of other things. (246)

اسلامی تاریخ ہر آدمی کے لئے ایک زندہ رہنما ہے۔ وہ ہر موقع پر آدمی کو متوازن بناتی ہے۔ اسلامی تاریخ کے اندر کسی "بادشاہ" کے لئے بھی اتنی ہی رہنمائی ہے جتنی ایک "معمولی" انسان کے لئے۔

اندھیرے کے بعد اجالا

قبائلی نظام میں آدمی قبیلہ کی حمایت کے تحت زندگی گزارتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے ابتدائی زمانہ میں اپنے چچا ابوطالب کی حمایت میں رہے جو قبیلہ بنو ہاشم کے سردار تھے۔ نبوت کے دسویں سال ابوطالب کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد قبائلی روایات کے مطابق ابولہب قبیلہ بنو ہاشم کا سردار مقرر ہوا۔ اس نے آپ کی حمایت سے انکار کر دیا۔ اب آپ نے ارادہ کیا کہ کسی دوسرے قبیلہ کی حمایت حاصل کر کے اپنا دعوتی کام جاری رکھیں۔ اس غرض کے تحت آپ نے طائف کا سفر فرمایا۔

طائف مکہ کے جنوب مشرق میں ۶۵ میل کے فاصلہ پر ایک سرسبز و شاداب بستی تھی۔ وہاں آپ کے بعض رشتہ دار تھے۔ چنانچہ آپ اپنے خادم زید بن حارثہ کو لے کر طائف پہنچے۔ اس وقت وہاں کی آبادی میں تین ممتاز سردار تھے۔ عبد یالیل، مسعود اور حبیب۔ آپ ان تینوں سے ملے۔ مگر ہر ایک نے آپ کا ساتھ دینے یا آپ کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا: خدا نے اگر تم کو رسول بنایا ہو تو میں کعبہ کا پردہ پھاڑ ڈالوں۔ دوسرے نے کہا: خدا کو کیا تمھارے سوا کوئی نہ ملا تھا جس کو وہ رسول بنا کر بھیجتا۔ تیسرے نے کہا: خدا کی قسم میں تم سے بات نہیں کروں گا۔ اگر تم رسول ہو تو تمھارا جواب دینا گستاخی ہے اور اگر تم جھوٹے ہو تو میرے لئے مناسب نہیں کہ میں تم سے بات کروں (فقال له احدهم هو يمزط ثياب الكعبة إن كان الله ارسلك۔ وقال الآخر اما وجد الله احداً يرسله غيرك۔ وقال الثالث والله لا اكلمك ابداً۔ لئن كنت رسولاً من الله كما تقول لانت اعظم خطراً من ان ارد عليك الكلام ولئن كنت تكذب على الله ما ينبغي لي ان اكلمك، سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۲۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غم گین ہو کر واپس ہوئے۔ مگر ان لوگوں نے پھر بھی آپ کو نہ بخشا۔ انھوں نے بستی کے لڑکوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا۔ وہ گالیوں اور پتھروں سے آپ کا پیچھا کرتے رہے۔ آپ کے خادم زید بن حارثہ نے اپنے کمل سے آپ کو آڑ میں لینے کی کوشش کی۔ مگر وہ آپ کو بچانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اور آپ کا جسم لہولہان ہوگیا۔

بستی سے کچھ دور جا کر عتبہ اور شیبہ دو بھائیوں کا انگور کا باغ تھا۔ یہاں پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی اور آپ نے اس باغ میں پناہ لی۔ آپ زخموں سے چور تھے اور اللہ سے دعا کر رہے تھے کہ خدایا میری مدد فرما، مجھے تنہا نہ چھوڑ دے۔

عتبہ اور شیبہ دونوں مشرک تھے۔ مگر جب انھوں نے آپ کا حال دیکھا تو ان کو آپ کے اوپر

رحم آگیا۔ انھوں نے اپنے نصرانی غلام کو بلایا جس کا نام عداس تھا۔ انھوں نے عداس سے کہا کہ ان انگوروں کے کچھ خوشے لو اور ان کو ایک برتن میں رکھ کر اس آدمی کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ اس میں سے کھائے۔ عداس نے ایسا ہی کیا۔ وہ انگور لے کر آیا اور اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھ دیا اور کہا کہ یہ کھاؤ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اس کو اپنے ہاتھ میں لیا تو بسم اللہ کہا اور پھر کھایا۔

عداس نے آپ کے چہرہ کی طرف دیکھا اور کہا: خدا کی قسم یہ جو آپ نے کہا، اس ملک کے لوگ ایسا نہیں کہتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: اے عداس، تم کس ملک کے رہنے والے ہو اور تمھارا دین کیا ہے۔ عداس نے کہا: میں نصرانی ہوں اور میں نینوا (عراق) کا رہنے والا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: مرد صالح یونس بن متی کے شہر کا۔ عداس نے کہا: آپ کو کیسے معلوم کہ یونس بن متی کون تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: وہ میرے بھائی ہیں۔ وہ نبی تھے اور میں بھی نبی ہوں (ذاك اخی۔ كان نبيا وانا نبی)

یہ سن کر عداس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھک پڑا اور آپ کے سر اور ہاتھ اور پاؤں کو چومنے لگا۔

عتبہ اور شیبہ اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا: دیکھو اس شخص نے تمھارے غلام کو خراب کر دیا۔ عداس جب لوٹ کر آیا تو انھوں نے اس سے کہا: عداس تمھارا برا ہو۔ تم کو کیا ہوا کہ تم اس کے سر اور ہاتھ اور پاؤں کو چومنے لگے۔ عداس نے کہا اے میرے آقا، زمین پر اس سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ اس آدمی نے مجھ کو ایسی بات بتائی جس کو صرف ایک نبی ہی جان سکتا ہے۔ دونوں نے کہا: اے عداس، تمھارا برا ہو۔ وہ تم کو تمھارے دین سے پھیر نہ دے۔ کیونکہ تیرا دین اس کے دین سے بہتر ہے (سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۳۰)

خدا کے رسول کو ایک ہی سفر میں مختلف لوگوں سے تین الگ الگ قسم کے سلوک کا تجربہ ہوا:

ایک نے آپ کے اوپر پتھر پھینکے۔

دوسرے نے آپ کی ضیافت کی۔

تیسرے نے آپ کی نبوت کا اقرار کر لیا۔

اس واقعہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ یہ سبق کہ اس دنیا میں امکانات کی کوئی حد نہیں۔ یہاں اگر چٹیل میدان ہیں تو وہیں سایہ دار درخت بھی کھڑے ہوئے ہیں۔ دنیا کی زندگی میں کچھ لوگوں سے اگر برے سلوک کا تجربہ ہو تو آدمی کو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ آدمی اگر خود سچائی پر قائم رہے۔ وہ اپنے دل کو منفی جذبات سے بچائے تو ضرور اس کو خدا کی مدد حاصل ہوگی۔ ایک قسم کے لوگ اگر اس کا ساتھ نہ دیں گے تو کچھ دوسرے لوگوں کے دل اس کے لئے نرم کر دئے جائیں گے۔

کچھ اور کرنا ہے

اٹھارویں صدی میں جن انگریزوں کی سرفروشی نے ہندستان کو برطانیہ کی نوآبادی بنایا ان میں لارڈ رابرٹ کلائو (۱۷۲۵ — ۱۷۷۴) کا نام سرفہرست ہے۔ ۱۷۴۳ میں جبکہ اس کی عمر ۱۸ سال تھی، وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک کلرک کی حیثیت سے مدراس آیا۔ اس وقت اس کی تنخواہ صرف پانچ پونڈ سالانہ تھی۔ یہ رقم اس کے خرچ کے لئے بہت ناکافی تھی۔ چنانچہ وہ قرضوں کے بوجھ کے نیچے دبا رہتا اور مایوسانہ جھنجلاہٹ کے تحت اپنے ساتھیوں اور افسروں سے لڑتا جھگڑتا رہتا۔

اس کے بعد ایک حادثہ ہوا جس نے اس کی زندگی کے رخ کو بدل دیا۔ اس نے اپنی ناکام زندگی کو ختم کرنے کے لئے ایک روز بھرا ہوا پستول لیا اور اپنے سر کے اوپر رکھ کر اس کی نلی دبا دی۔ مگر اس کو سخت حیرت ہوئی جب اس نے دیکھا کہ اس کا پستول نہیں چلا ہے۔ اس نے پستول کھول کر دیکھا تو وہ گولیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اپنے ارادہ کی حد تک اپنے کو ہلاک کر لینے کے باوجود وہ بدستور زندہ حالت میں موجود تھا۔

یہ بڑا عجیب واقعہ تھا۔ رابرٹ کلائیو اس کو دیکھ کر چلا اٹھا: خدا نے یقیناً تم کو کسی اہم کام کے لئے محفوظ رکھا ہے"۔ اب اس نے کلرکی چھوڑ دی اور انگریزی فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اس زمانہ میں انگریز اور فرانسیسی دونوں بیک وقت ہندستان میں اپنا قدم جمانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں دونوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں رابرٹ کلائیو نے غیر معمولی صلاحیت اور بہادری کا ثبوت دیا۔ اس کے بعد اس نے ترقی کی اور اس کو انگریزی فوج میں کمانڈر انچیف کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ جس کلائیو نے مایوس ہو کر خود اپنے ہاتھ سے اپنے اوپر پستول چلا لیا تھا، اسی کو اس کے بعد یہ مقام ملا کہ برطانیہ کی تاریخ میں اس کو ہندستان کے اولین فاتح کی حیثیت سے لکھا جائے۔

ہم میں سے ہر شخص کے ساتھ یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ وہ کسی شدید خطرہ میں پڑنے کے باوجود معجزاتی طور پر اس سے بچ جاتا ہے۔ تاہم بہت کم لوگ ہیں جو رابرٹ کلائیو کی طرح اس سے سبق لیتے ہوں۔ جو اس طرح کے واقعات میں قدرت کا یہ اشارہ پڑھ لیتے ہوں کہ ——— ابھی تمہارا وقت نہیں آیا، ابھی دنیا میں تم کو اپنے حصہ کا کام کرنا باقی ہے۔

ہر آدمی کو دنیا میں کام کرنے کی ایک مدت اور کچھ مواقع دئے گئے ہیں۔ یہ مدت اور مواقع اس سے اس وقت تک نہیں چھنتے جب تک خدا کا لکھا پورا نہ ہو جائے۔ اگر رات کے بعد خدا آپ کے اوپر صبح طلوع کرے تو سمجھ لیجئے کہ خدا کے نزدیک ابھی آپ کے عمل کے کچھ دن باقی ہیں۔ اگر آپ حادثات کی اس دنیا میں اپنی زندگی کو بچانے میں کامیاب ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے منصوبہ کے مطابق آپ کو کچھ اور کرنا ہے جو ابھی آپ نے نہیں کیا۔

خدا کا اعتماد سب سے بڑا اعتماد

دوسری جنگ عظیم میں جب اتحادی طاقتوں نے بالآخر جرمنی کو شکست دے دی تو تمام نازی لیڈروں کو اسی برلن میں پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا گیا جہاں وہ ساری دنیا کے قتل کا منصوبہ بنایا کرتے تھے۔

یہ واقعہ اکتوبر ۱۹۴۶ کا ہے۔ ہٹلر اور گوئرنگ نے تو پہلے ہی خودکشی کر لی تھی۔ اس کے بعد رین ٹراپ، کیٹل، کیلٹن برنر، الفریڈ روزن برگ، فرنیک، ولہم فرک جولیس، ساکل، جوڈل، سس انکوارٹ اور دوسرے نازی لیڈر جو زندہ بچے تھے، ایک ایک کر کے ختم کر دئے گئے۔

یہ وہ لیڈر تھے جنھوں نے چالیس لاکھ یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور ان کی املاک پر قبضہ کر لیا تھا۔ انھوں نے ایک ایسی خونی جنگ چھیڑی تھی جس میں ان کے مفروضہ دشمنوں کے علاوہ خود جرمن قوم کے ۲۰ لاکھ سپاہی کام آئے۔ انھوں نے لاکھوں انسانوں کو بیگار کیمپوں (Concentration Camp) میں جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ ان کی درندگی کا یہ عالم تھا کہ اپنے ملک کے بوڑھے، معذور اور بیمار لوگوں کو ـــــ "جرمنی کے لئے بے فائدہ" قرار دے کر گولی سے اڑا دیتے۔ مقتول بچوں، لاشوں سے اٹے ہوئے گڑھوں اور بیواؤں اور یتیموں کے غول کو دیکھ کر بھی ان کا پتھر جیسا دل پسیجنا نہیں جانتا تھا۔

مگر شکست کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ جب وہ پھانسی کے تختے کے سامنے لائے گئے تو ان کے چہرے زرد تھے۔ ان کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں، وہ کچھ بولنا چاہتے تو معلوم ہوتا کہ زبان ان کا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ شعلہ بیان لیڈر گویائی کی طاقت کھو چکے تھے۔ جو دوسروں کی زندگیوں سے کھیلتے تھے وہ اپنے انجام کو دیکھ کر بالکل ہو گئے۔

جس بہادری کا انحصار صرف مادی سہارے پر ہو وہ اس وقت بزدلی میں تبدیل ہو جاتی ہے جبکہ مادی سہارا اس سے چھن جائے۔ البتہ جس کا اعتماد خدائے لازوال پر ہو، وہ ہر حال میں شجاعت و عزیمت کی چٹان بنا رہتا ہے۔ خواہ مادی سہارے اس کا ساتھ دے رہے ہوں یا اس قسم کے تمام خارجی سہاروں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔

اگر خدا کی مدد کا یقین دلوں میں زندہ ہو تو آدمی کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہو سکتا۔ وہ طاقت ور دشمنوں میں گھر کر بھی عزم و ہمت کی چٹان بنا رہے گا۔ قاتلوں اور غارت گروں کے ہجوم سے بھی وہ اس طرح زندہ سلامت نکل آئے گا جیسے وہاں کسی کا وجود ہی نہ تھا۔

رسی کا سبق

ایک شخص کے دس لڑکے تھے۔ سب لڑکے تندرست اور ہوشیار تھے اور مل جل کر رہتے تھے۔ اس کی وجہ سے ہر جگہ ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کا ہر کام آسانی سے ہو جاتا تھا۔ کوئی شخص ان کے خلاف کارروائی کرنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ اس خاندان کا اتحاد اور اس کی طاقت لوگوں کے درمیان ضرب المثل بن گئی تھی۔

لڑکوں کا باپ بوڑھا ہو کر مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس کو سب سے زیادہ اندیشہ یہ ہوا کہ اس کے بعد اس کے لڑکے باہمی اختلاف کا شکار ہو کر الگ الگ نہ ہو جائیں اور اس طرح اپنے آپ کو کمزور کر لیں۔ سوچتے سوچتے ایک تدبیر اس کے ذہن میں آئی۔ اس نے ایک روز تمام لڑکوں کو بلایا اور کہا کہ دیکھو اب میں بہت جلد مر جاؤں گا۔ میں تم لوگوں کو ایک سبق دینا چاہتا ہوں۔ اگر تم میرے اس سبق کو یاد رکھو گے تو زندگی میں کبھی ناکام نہ ہو گے۔ اس کے بعد اس نے ایک موٹی رسی نکالی اور کہا کہ اس کو توڑو۔

ہر ایک نے باری باری کوشش کی۔ مگر پورا زور لگانے کے بعد بھی کوئی اسے توڑ نہ سکا۔ اس کے بعد سب نے مل کر اس کو توڑنے کی کوشش کی۔ مگر اب بھی وہ کامیاب نہ ہوئے۔ اب بوڑھے باپ نے یہ کیا کہ رسی کو کھولا تو اس کی دس لڑیاں الگ الگ ہو گئیں۔ اس نے ایک ایک لڑی ہر لڑکے کو دے کر کہا کہ اسے توڑو۔ اب معاملہ آسان تھا۔ ہر لڑکے نے معمولی کوشش سے اپنی اپنی رسی توڑ ڈالی۔ یکجا لڑیوں کو کوئی توڑ نہ سکا۔ مگر منتشر لڑیوں کو ہر ایک نے توڑ کر دو ٹکڑے کر دیا۔

اس تجربہ کے بعد باپ اپنے بیٹوں سے مخاطب ہوا۔ اس نے کہا: دیکھو، جب تک رسی کی دس لڑیاں ایک ساتھ ملی ہوئی تھیں، تم لوگ اسے توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ مگر وہی رسی جب الگ الگ لڑیوں میں بٹ گئی تو تم میں سے ہر شخص نے بآسانی اسے توڑ ڈالا۔ اسی مثال سے تم اپنا معاملہ سمجھ سکتے ہو۔

تم لوگ دس بھائی ہو۔ گویا یہ رسی کی دس لڑیاں ہیں جو اب تک ایک ساتھ ملی رہی ہیں۔ اس لئے تم لوگ ہر جگہ طاقت ور ثابت ہوتے رہے۔ کوئی تمہارا کچھ بگاڑ نہ سکا۔ اگر تم لوگ اسی طرح ایک ساتھ ملے رہو گے تو ہرگز کوئی تم کو توڑ نہ سکے گا۔ اور اگر تم الگ الگ ہو گئے تو تمہارے دشمن تم کو اسی طرح ایک ایک کر کے توڑ ڈالیں گے جس طرح تم نے رسی کی لڑیوں کو الگ الگ ہونے کے بعد توڑ دیا۔

ایک خاندان کا معاملہ ہو یا ایک قوم کا، سب کے لئے طاقت کا سب سے بڑا راز اتحاد ہے۔ وہی تعداد جو اختلاف کے وقت دوسروں کے مقابلہ میں بے زور دکھائی دیتی ہے وہی تعداد اگر متحد ہو جائے تو وہ اتنی طاقت ور ہو جائے گی کہ اس کا حریف اس پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت ہی نہ کرے۔

الٹا اہرام

دہلی کی سب سے اونچی عمارت وکاس مینار ہے۔ جب یہ عمارت بنی اور اخبار میں اس کی خبر چھپی تو خبر کا پہلا لفظ یہ تھا: "شہر کی ۲۱ منزلہ عمارت تیار ہوگئی"۔ ظاہر ہے کہ عمارت اس طرح نہیں بنی کہ اس کی ۲۱ ویں منزل سب سے پہلے بن کر کھڑی ہوگئی ہو۔ عمارت کی تعمیر کا کام اس کی بنیاد سے شروع ہوا۔ پھر ہوتے ہوتے کئی سال میں اوپری منزل تک پہنچا۔ مگر خبر کی ترتیب میں "۲۱ منزل" کا لفظ سب سے پہلے تھا۔

اخباروں میں خبر مرتب کرنے کا یہی طریقہ رائج ہے۔ اس طریقہ کو صحافتی اصطلاح میں مثلث معکوس یا الٹا احرام (Inverted Pyramid) کہتے ہیں۔ یعنی خبر کو اس کی اصلی ترتیب کے ساتھ بیان کرنے کے بجائے الٹی ترتیب کے ساتھ بیان کرنا۔ کوئی واقعہ جو ہماری زندگی میں پیش آتا ہے وہ ایک فطری ترتیب سے پیش آتا ہے۔ اس کی ایک ابتدا ہوتی ہے۔ پھر درمیانی اجزاء سامنے آتے ہیں۔ اس کے بعد اس کا آخری اور انتہائی جزء وقوع میں آتا ہے۔ یہ واقعہ کی فطری ترتیب ہے۔ مگر اخباری رپورٹر کو معاملہ کی واقعاتی ترتیب سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کے پیش نظر صرف یہ ہوتا ہے کہ فوراً کوئی بڑی سی بات کہہ کر قارئین کی توجہ اپنی طرف مائل کرلے۔ اسی لئے جب وہ خبر کو مرتب کرتا ہے تو وہ اس کی ترتیب کو الٹ دیتا ہے۔ اصل واقعہ کا جو جزء بالکل آخر میں پیش آیا تھا اس کو وہ آغاز میں رکھ دیتا ہے اور اس کے بعد پوری خبر بیان کرتا ہے۔ گویا کہ "اہرام" کے بننے کی ترتیب خبر کی صورت اختیار کرتے وقت الٹ جاتی ہے۔ اخباری رپورٹر ایسا اس لئے کرتا ہے تاکہ وہ پہلے ہی مرحلہ میں ناظرین کی توجہ اپنی طرف کھینچ سکے۔

"الٹا اہرام" اخبار کے صفحات میں بن سکتا ہے مگر وہ زمین پر نہیں بن سکتا۔ اسی طرح ملت کے مستقبل کا قلعہ بھی الٹی سمت سے صرف الفاظ کی دنیا میں کھڑا کیا جاسکتا ہے وہ حقیقت کی دنیا میں وجود میں نہیں آسکتا۔ اگر آپ کو تعمیر ملت کی لفظی مہم چلانا ہے تو وہ ایک "عہد آفریں" اعلان یا ایک "تاریخ ساز" اجلاس کے ذریعہ آخری منزل سے بھی شروع ہوسکتی ہے۔ مگر کوئی واقعی تعمیر اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ابتدائی مقام سے اپنے کام کا آغاز کیا جائے۔

الفاظ بولنے والا اپنے پہلے ہی جملہ میں آخری منزل پر چھلانگ لگاکر یہ کہہ سکتا ہے "شہر کی بیس منزلہ عمارت تیار ہوگئی"۔ لفظ بولنے والے کے لئے موقع ہے کہ وہ اپنے "عمل" کو آخری مرحلہ سے شروع کرے۔ مگر جو شخص ایک حقیقی واقعہ کو ظہور میں لانا چاہتا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے عمل کو ابتدار سے شروع کرے، وہ آخری منزل سے اپنے سفر کا آغاز نہیں کرسکتا۔

ایک وراثت یہ بھی ہے

کریم بخش سیدھے سادے دین دار آدمی تھے۔ گاؤں کی معمولی آمدنی پر گزر کر لیتے۔ ۶۵ سال کی عمر میں وہ چار بچے چھوڑ کر مرے تو ان کے لئے انھوں نے کوئی قابل ذکر جائداد نہیں چھوڑی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بڑے صاحب زادے رحیم بخش شہر چلے آئے تاکہ اپنے لئے کمائی کی کوئی صورت کر سکیں۔ شہر میں انھوں نے مختصر سرمایہ کے ساتھ ایک کاروبار شروع کر دیا۔

رحیم بخش کے والد نے ان کے لئے کوئی مادی وراثت نہیں چھوڑی تھی۔ مگر قناعت اور سادگی اور کسی سے لڑے بھڑے بغیر اپنا کام کرنے کی وراثت چھوڑی تھی۔ یہ وراثت رحیم بخش کے لئے بے حد مفید ثابت ہوئی۔ ان کی سادگی اور قناعت کا نتیجہ یہ ہوا کہ معمولی آمدنی کے باوجود وہ مسلسل ترقی کرنے لگے۔ ان کا لڑائی بھڑائی سے بچنے کا مزاج ان کے لئے مزید معاون ثابت ہوا۔ ہر ایک ان سے خوش تھا۔ ہر ایک سے ان کو تعاون مل رہا تھا۔ ان کی ترقی کی رفتار اگرچہ سست تھی مگر وہ ایک دن رکے بغیر جاری رہی۔

رحیم بخش کا کاروبار اگرچہ معمولی تھا مگر ان کی شرافت، ان کی بے غرضی اور ان کی ایمان داری نے ان کو اپنے ماحول میں اتنی عزت دے رکھی تھی جیسے کہ وہ کوئی بڑی حیثیت کے آدمی ہوں۔ ان کے پاس سرمایہ بہت کم تھا مگر لین دین میں صفائی اور وعدہ کا پکا ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بازار میں بڑے بڑے تھوک بیوپاری ان سے کہتے کہ "میاں جی، جتنا چاہے مال لے جاؤ۔ پیسہ کی پروا نہ کرو۔ پیسے بعد کو آجائیں گے"۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ کسی سے جھگڑے کی نوبت آگئی۔ مگر انھوں نے خود ہی اپنے کو چپ کر لیا۔ وہ شریر آدمی کے خلاف کوئی جوابی کارروائی نہ کرتے بلکہ خاموشی سے اپنے کاروبار میں لگ جاتے اور اس کے حق میں دعا کرنے رہتے۔ جب بھی ان کے دل میں شیطان کوئی بدمعاملگی کا جذبہ ڈالتا تو ان کے والد کا معصوم چہرہ ان کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا۔ ان کو ایسا محسوس ہوتا کہ اگر میں نے کوئی غلط معاملہ کیا یا کسی سے جھگڑا فساد کیا تو میرے باپ کی روح قبر میں تڑپ اٹھے گی۔ یہ خیال فوراً ان کے جذبات کو دبا دیتا۔ وہ دوبارہ اسی تعمیری راستہ پر چل پڑتے جس میں انھیں ان کے باپ نے چھوڑا تھا۔

ان کا کاروبار بڑھا تو ان کو مزید معاون کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اب انھوں نے اپنے بھائیوں کو بلانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ چاروں بھائی شہر میں منتقل ہو گئے۔ دھیرے دھیرے ان کے کاروبار کے چار مستقل شعبے ہو گئے۔ ہر شعبہ ایک ایک بھائی کے سپرد تھا۔ چاروں بھائی ایک ساتھ مل کر رہتے اور ساتھ کھاتے پیتے۔ مگر کاروباری اعتبار سے ہر بھائی اپنے اپنے شعبہ کو آزادانہ طور پر انجام دیتا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد رحیم بخش کو محسوس ہوا کہ بڑے بھائی ہونے کی حیثیت سے چونکہ وہی کاروبار کے مالک ہیں اس لئے بقیہ بھائی اپنے کام کو اس دل چسپی سے نہیں کرتے جیسا کہ کوئی آدمی اس وقت کرتا ہے جب کہ وہ کام کو اپنا ذاتی کام سمجھتا ہو۔ اب رحیم بخش کے لئے دو صورتوں میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے کا سوال تھا۔ یا تو کاروبار کو اپنے قبضہ میں لے کر بقیہ تینوں بھائیوں کو اس سے الگ کر دیں اور اس کے نتیجہ میں ہمیشہ کے لئے بھائیوں کی دشمنی خریدیں۔ دوسرے یہ کہ معاملات کو اسی طرح چلنے دیں۔ یہاں تک کہ بالآخر وہی ہو جو عام طور پر مشترک کاروبار میں ہوتا ہے۔ یعنی باہمی شکایت اور اس کے بعد تلخ یادوں کے ساتھ کاروبار کی تقسیم۔

رحیم بخش نے چند دن سوچا اور اس کے بعد سب بھائیوں کو جمع کر کے ساری بات صاف صاف ان کے سامنے رکھ دی۔ انھوں نے کہا کہ خدا کے فضل سے ابھی کوئی بات بگڑی نہیں ہے۔ بہترین بات یہ ہے کہ چاروں بھائی ایک ایک کاروبار کو لے لیں اور ہر ایک ذاتی طور پر اپنا کاروبار چلائے۔ اس طرح ہمارے والد کی روح کو سکون پہنچے گا اور مجھے یقین ہے کہ اس میں ہر ایک کے لئے زیادہ برکت ہوگی۔ تینوں بھائیوں نے کہا کہ ہم تو سراپا آپ کے احسان مند ہیں۔ اس لئے آپ جو بھی فیصلہ کر دیں وہ ہم کو منظور ہے۔ مختصر گفتگو کے بعد یہ طے ہوا کہ قرعہ اندازی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ چنانچہ اسی وقت قرعہ کے ذریعہ ہر بھائی کو ایک ایک کاروبار دے دیا گیا۔

اب چاروں بھائی اپنے اپنے کاروبار میں لگے ہوئے ہیں۔ ہر ایک اپنے بچوں کو لے کر اپنے اپنے کام میں صبح سے شام تک محنت کرتا ہے۔ چاروں کے درمیان پہلے سے بھی زیادہ اچھے تعلقات ہیں۔ ہر ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ چاروں نے الگ الگ اپنے مکانات بنا لئے ہیں۔ مگر رحیم بخش اب بھی اسی طرح سب کے "بڑے بھائی" ہیں جیسے وہ پہلے بڑے بھائی تھے۔ ایک بھائی جو بات کہہ دے اس کو دوسرا بھائی کبھی نہیں ٹالتا۔ ایک گھر میں کوئی ضرورت پیش آجائے تو چاروں گھر والوں کی عورتیں اور بچے مل کر اس کو اس طرح کرتے ہیں جیسے وہ ہر ایک کا اپنا کام ہو۔

اکثر باپ یہ سمجھتے ہیں کہ اپنی اولاد کے لئے سب سے بڑی وراثت یہ ہے کہ وہ ان کے لئے مال اور جائداد چھوڑ کر اس دنیا سے جائیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ سب سے زیادہ خوش نصیب اولاد وہ ہے جس کے باپ نے اس کے لئے با اصول زندگی کی وراثت چھوڑی ہو۔ وہ اپنی اولاد کو یہ سبق دے کر دنیا سے گیا ہو کہ اپنی محنت پر بھروسہ کرو، لوگوں سے الجھے بغیر اپنا کام کرو۔ اپنے واجبی حق پر قناعت کرو۔ حال کے فائدوں سے زیادہ مستقبل کے امکانات پر نظر رکھو۔ خوش خیالیوں میں گم ہونے کے بجائے حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرو۔ مادی وراثت سے زیادہ بڑی چیز اخلاقی وراثت ہے۔ مگر بہت کم باپ ہیں جو اس حقیقت کو جانتے ہوں۔

استحقاق پیدا کیجئے

ایم اے خان ہائر سکنڈری کے امتحان میں اچھے نمبر سے پاس ہوئے تھے۔ مگر کسی وجہ سے وہ بروقت آگے داخلہ نہ لے سکے۔ یہاں تک کہ اکتوبر کا مہینہ آگیا۔ اب بظاہر کہیں داخلہ ملنے کی صورت نہ تھی۔ تاہم تعلیم کا شوق ان کو ہندو سائنس کالج کے پرنسپل کے دفتر میں لے گیا۔

"جناب، میں بی ایس سی میں داخلہ لینا چاہتا ہوں" انھوں نے ہندو پرنسپل سے کہا۔

"یہ اکتوبر کا مہینہ ہے، داخلے بند ہو چکے ہیں۔ اب کیسے تمھارا داخلہ ہوگا"

"بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ داخلہ لے لیں۔ ورنہ میرا پورا سال بیکار ہو جائے گا'

"ہمارے یہاں تمام سیٹیں بھر چکی ہیں۔ اب مزید داخلہ کی کوئی گنجائش نہیں"

پرنسپل اتنی بے رخی برت رہا تھا کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہرگز داخلہ نہیں لے گا اور اگلا جملہ طالب علم کو شاید یہ سننا پڑے گا کہ "کمرہ سے نکل جاؤ"، مگر طالب علم کے اصرار پر اس نے بددلی سے پوچھا "تمھارے مارکس کتنے ہیں"۔ پرنسپل کا خیال تھا کہ اس کے نمبر یقیناً بہت کم ہوں گے۔ اسی لئے اس کو کہیں داخلہ نہیں ملا۔ چنانچہ طالب علم جب اپنے خراب نتیجہ کو بتائے گا تو اس کی درخواست کو رد کرنے کے لئے معقول وجہ ہاتھ آجائے گی۔ مگر طالب علم کا جواب اس کی امید کے خلاف تھا۔ اس نے کہا جناب ۸۵ فی صد :

Sir, eighty five per cent

اس جملہ نے پرنسپل پر جادو کا کام کیا۔ فوراً اس کا موڈ بدل گیا۔ اس نے کہا "بیٹھو بیٹھو" اس کے بعد اس نے طالب علم کے کاغذات دیکھے اور جب کاغذات نے تصدیق کر دی کہ واقعی وہ پچاسی فی صد نمبروں سے پاس ہوا ہے تو اسی وقت اس نے پچھلی تاریخ میں درخواست لکھوائی۔ اس نے ایم اے خان کو نہ صرف تاخیر کے باوجود اپنے کالج میں داخل کر لیا بلکہ کوشش کر کے ان کو ایک وظیفہ بھی دلوایا۔

یہی طالب علم اگر اس حالت میں پرنسپل کے پاس جاتا کہ وہ تھرڈ کلاس پاس ہوتا اور پرنسپل اس کا داخلہ نہ لیتا تو طالب علم کا تاثر کیا ہوتا۔ وہ اس طرح لوٹتا کہ اس کے دل میں نفرت اور شکایت بھری ہوتی۔ وہ لوگوں سے کہتا کہ یہ سب تعصب کی وجہ سے ہوا ہے۔ ورنہ میرا داخلہ ضرور ہونا چاہئے تھا۔ داخلہ نہ ملنے کی وجہ اس کا خراب نتیجہ ہوتا مگر اس کا ذمہ دار وہ ہندو کالج کو قرار دیتا۔ ماحول کا ردعمل اکثر خود ہماری حالت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مگر ہم اس کو ماحول کی طرف منسوب کر دیتے ہیں تاکہ اپنے آپ کو بری الذمہ ثابت کر سکیں۔

اگر آدمی نے خود اپنی طرف سے کوتاہی نہ کی ہو، اگر زندگی میں وہ ان تیاریوں کے ساتھ داخل ہوا ہو جو زمانہ نے مقرر کی ہیں تو دنیا اس کو جگہ دینے پر مجبور ہوگی۔ وہ ہر ماحول میں اپنا مقام پیدا کر لے گا، وہ ہر بازار سے اپنی پوری قیمت وصول کرے گا۔ مزید یہ کہ ایسی حالت میں اس کے اندر اعلیٰ اخلاقیات کی پرورش ہوگی۔ وہ اپنے

تجربات سے جرأت، اعتماد، عالی حوصلگی، شرافت، دوسروں کا اعتراف، حقیقت پسندی، ہر ایک سے صحیح انسانی تعلق کا سبق سیکھے گا۔ وہ شکایت کی نفسیات سے بلند ہو کر سوچے گا۔ ماحول اس کو تسلیم کرے گا۔ اس لئے وہ خود بھی ماحول کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوگا۔

اس کے برعکس اگر اس نے اپنے کو اہل ثابت کرنے میں کوتاہی کی ہو۔ اگر وہ وقت کے معیار پر پورا نہ اترتا ہو۔ اگر وہ کم تر لیاقت کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوا ہو تو لازماً وہ دنیا کے اندر اپنی جگہ بنانے میں ناکام رہے گا۔ اور اس کے نتیجہ میں اس کے اندر جو اخلاقیات پیدا ہوں گی وہ بلاشبہ پست اخلاقیات ہوں گی۔ وہ شکایت، جھنجلاہٹ، غصہ، حتیٰ کہ مجرمانہ ذہنیت کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ جب آدمی ناکام ہوتا ہے تو اس کے اندر غلط قسم کی نفسیات ابھرتی ہیں۔ اگرچہ آدمی کی ناکامی کی وجہ ہمیشہ اپنی کمزوری ہوتی ہے۔ مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو قصوروار ٹھہرائے۔ وہ ہمیشہ اپنی ناکامیوں کے لئے دوسروں کو مجرم ٹھہراتا ہے۔ وہ صورت حال کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ کم تر تیاری آدمی کو بیک وقت دو قسم کے نقصانات کا تحفہ دیتی ہے ——— اپنے لئے بے جا طور پر ناکامی اور دوسروں کے بارے میں بے جا طور پر شکایت۔

پتھر ہر ایک کے لئے سخت ہے۔ البتہ وہ اس آدمی کے لئے نرم ہو جاتا ہے جو اس کو توڑنے کا اوزار رکھتا ہو۔ یہی صورت ہر معاملہ میں پیش آتی ہے۔ اگر آپ لیاقت اور اہلیت کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوئے ہوں تو آپ اپنی واقعی حیثیت سے بھی زیادہ حق اپنے لئے وصول کر سکتے ہیں۔ "وقت" گزرنے کے بعد بھی ایک اجنبی کالج میں آپ کا داخلہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر لیاقت اور اہلیت کے بغیر آپ نے زندگی کے میدان میں قدم رکھا ہے تو آپ کو اپنا واقعی حق بھی نہیں مل سکتا۔

گیس نیچے نہیں سماتی تو اوپر اٹھ کر اپنے لئے جگہ حاصل کرتی ہے۔ پانی کو اونچائی آگے بڑھنے نہیں دیتی تو وہ نشیب کی طرف سے اپنا راستہ بنا لیتا ہے۔ درخت سطح کے اوپر قائم نہیں ہو سکتا تو وہ زمین پھاڑ کر اس سے اپنے لئے زندگی کا حق وصول کر لیتا ہے۔ یہ طریقہ جو غیر انسانی دنیا میں خدا نے اپنے براہ راست انتظام کے تحت قائم کر رکھا ہے وہی انسان کو بھی اپنے حالات کے اعتبار سے اختیار کرنا ہے۔

ہر آدمی جو دنیا میں اپنے آپ کو کامیاب دیکھنا چاہتا ہو اس کو سب سے پہلے اپنے اندر کامیابی کا استحقاق پیدا کرنا چاہئے۔ اس کو چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو جانے اور پھر اپنے حالات کو سمجھے۔ اپنی قوتوں کو صحیح ڈھنگ سے منظم کرے۔ جب وہ ماحول کے اندر داخل ہو تو اس طرح داخل ہو کہ اس کے مقابلہ میں اپنی اہلیت ثابت کرنے کے لئے وہ اپنے آپ کو پوری طرح مسلح کر چکا ہو۔ اس نے حالات سے اپنی اہمیت منوانے کے لئے ضروری سامان کر لیا ہو۔ اگر یہ سب ہو جائے تو اس کے بعد آپ کے عمل کا جو دوسرا لازمی نتیجہ سامنے آئے گا وہ وہی ہوگا جس کا نام ہماری زبان میں کامیابی ہے۔ (۲۴ نومبر ۱۹۶۷)

جب پردہ اٹھے گا

امریکی صدر رونالڈ ریگن ۳۰ مارچ ۱۹۸۱ کو پر اعتماد چہرہ کے ساتھ اپنے صدارتی محل (وھائٹ ہاؤس) سے نکلے۔ کاروں کا قافلہ ان کو لے کر واشنگٹن کے ہلٹن ہوٹل کی طرف روانہ ہوا۔ پروگرام کے مطابق انھوں نے ہوٹل کے شان دار ہال میں ایک تقریر کی۔ تحسین و آفریں کی فضا میں ان کی تقریر ختم ہوئی۔ وہ آدمیوں کے ہجوم میں ہنستے ہوئے چہرہ کے ساتھ باہر آئے۔ وہ اپنی گولی پروف لیموشین (کار) سے صرف چند قدم کے فاصلہ پر تھے کہ اچانک باہر کھڑے ہوئے مجمع کی طرف سے گولیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک نوجوان جان ہنکلے نے دو سکنڈ کے اندر چھ فائر کیے۔ ایک گولی مسٹر ریگن کے سینہ پر لگی۔ وہ خون میں لت پت ہو گئے اور فوراً اسپتال پہنچائے گئے۔ اچانک گولی لگنے کے بعد صدر امریکہ کا جو حال ہوا وہ اے پی کا رپورٹر ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

Mr Reagan appeared stunned. The smile faded from his lips

مسٹر ریگن جیسے سن ہو گئے۔ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں سے غائب ہو گئی (ٹائمس آف انڈیا ۳۱ مارچ ۱۹۸۱) یہ واقعہ اس صورت حال کی ایک تصویر ہے جو موت کے "حملہ" کے وقت اچانک آدمی پر طاری ہوگی۔

آدمی موجودہ دنیا میں اپنے کو آزاد سمجھ رہا ہے۔ وہ نڈر ہو کر جو چاہے بولتا ہے اور جو چاہے کرتا ہے۔ اگر کسی کو کچھ مال ہاتھ آگیا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ میرا مستقبل محفوظ ہے۔ کسی کو کوئی اقتدار حاصل ہے تو وہ اپنے اقتدار کو اس طرح استعمال کرتا ہے جیسے اس کا اقتدار کبھی چھننے والا نہیں۔ ہر آدمی پُر اعتماد چہرہ لئے ہوئے ہے۔ ہر آدمی ہنستے ہوئے اپنی "لیموشین" کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے بعد اچانک پردہ اٹھتا ہے۔ موت کا فرشتہ اس کو موجودہ دنیا سے نکال کر اگلی دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔

یہ ہر آدمی کی زندگی کا ایک انتہائی بھیانک لمحہ ہے۔ جب یہ لمحہ آتا ہے تو آدمی اپنے اندازہ کے بالکل خلاف صورت حال کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو جاتا ہے۔ اچانک اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ محض دھوکا تھا جس کو اس نے سب سے بڑی حقیقت سمجھ لیا تھا ـــــ میں نے اپنے کو آزاد سمجھا تھا مگر میں تو بالکل بے اختیار نکلا۔ میں اپنے کو مال و جائداد والا پا رہا تھا مگر میں تو بالکل خالی ہاتھ تھا۔ میرا خیال تھا کہ میرے پاس طاقت ہے۔ مگر میں تو خدا کی اس دنیا میں مکھی اور مچھر سے بھی زیادہ بے زور تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ میرے ساتھ بہت سے لوگ ہیں مگر یہاں تو میرا کوئی ایک بھی نہیں۔

آہ وہ انسان جو اسی بات کو نہیں جانتا جس کو اسے سب سے زیادہ جاننا چاہئے۔

مذہب کی اہمیت

کہا جاتا ہے کہ جدید تہذیب نے مذہب کو فرسودہ اور غیر ضروری ثابت کر دیا ہے۔

وہ کیا چیز ہے جو مغربی تہذیب نے انسانیت کو دی ہے۔ وہ ہیں جدید طرز کی سواریاں۔ نئے طرز کے مکانات، نئے قسم کے ذرائع مواصلات۔ نئے قسم کے لباس۔ مختصر یہ کہ دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے نئے ساز و سامان جو پچھلے سامانوں کے مقابلہ میں زیادہ آرام دہ، زیادہ خوش نما اور زیادہ سریع العمل ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس قسم کے سامانوں کا خدا اور مذہب پر عقیدہ رکھنے یا نہ رکھنے کے مسئلہ سے کیا تعلق

کیا کسی کے پاس جدید طرز کی رہائش گاہ اور موٹر کار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے لئے خدا کا وجود بے معنی ہو گیا۔ کیا تار اور ٹیلی فون کے ذریعہ خبر رسانی سے وحی والہام کے عقیدے کی تردید ہو جاتی ہے۔ کیا ہوائی جہاز اور راکٹ کے ذریعہ فضا میں اڑنے کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کا اس کائنات میں کہیں وجود نہیں ہے۔ کیا لذیذ کھانے، خوش نما لباس اور اعلیٰ فرنیچر کے وجود میں آنے کے بعد جنت و دوزخ کو ماننے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ کیا جدید عورتوں کے اندر یہ صلاحیت کہ وہ ٹائپ رائٹر کی بورڈ پر اپنی انگلیاں تیزی سے چلا سکتی ہیں یہ ثابت کرتا ہے کہ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ کی آیت منسوخ ہو گئی۔ کیا اسمبلی اور پارلیمنٹ کی شاندار عمارتوں میں بیٹھ کر کچھ لوگوں کا قانون سازی کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ شریعت کا قانون بے معنی ہو گیا ہے۔

نئے ساز و سامان اور نئے ذرائع و وسائل کی اہمیت و افادیت کو تسلیم کرتے ہوئے ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ان کا مذہب کی صداقتوں کی تائید یا تردید سے کیا تعلق ہے۔

مذہب کا تعلق قدروں (Values) سے ہے نہ کہ تمدنی مظاہر سے۔ تمدنی مظاہر بدلتے رہتے ہیں، مگر زندگی کی قدروں میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ جدید طرز کی تیز رفتار سواریوں نے قدیم طرز کی سست رفتار گاڑیوں کو فرسودہ قرار دے دیا ہے۔ مگر اس مسئلہ کی اہمیت بدستور اپنی جگہ قائم ہے کہ آدمی سواریوں کو بنانے اور استعمال کرنے میں کن اخلاقی اصولوں کا لحاظ کرے۔ جدید مواصلاتی ذرائع نے قدیم طرز کے پیغام رسانی کے طریقوں کو بے فائدہ ثابت کر دیا ہے۔ مگر اس سوال کی اہمیت میں اب بھی کوئی فرق نہیں ہوا کہ ان مواصلات کو جھوٹ کی اشاعت کے لئے استعمال کیا جائے یا سچ کی اشاعت کے لئے۔

پارلیمنٹ کے ممبران خواہ پیدل چل کر پارلیمنٹ ہاؤس پہنچیں یا ہوائی جہازوں پر اڑ کر آئیں، اس اصول کی اہمیت بدستور باقی رہے گی کہ ان کی قانون سازی کا کام اسی خدائی قانون کی مطابقت میں ہونا چاہئے جس پر ساری کائنات کا نظام چل رہا ہے۔ عدالت کے دفاتر خواہ چھپر میں ہوں یا کسی عالی شان عمارت میں، یہ معیار یکساں طور پر باقی رہے گا کہ عدالتوں کو اس طرح کام کرنا چاہئے کہ کوئی شخص اپنا جائز حق لینے سے محروم نہ رہے اور نہ کوئی شخص اپنے جرم کی سزا پانے سے۔

زبان جنت بھی ہے اور جہنم بھی

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ان العبد لیتکلم بالکلمۃ من رضوان اللہ تعالیٰ ما یُلقی لہا بالاً یرفعہ اللہ بہا درجاتٍ، وان العبد لیتکلم بالکلمۃ من سخط اللہ تعالیٰ لا یُلقی لہا بالاً یہوی بہا فی جہنم (بخاری، کتاب الرقاق)

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ بندہ اللہ کی رضا کی ایک بات کہتا ہے اور اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا مگر اس کی وجہ سے اللہ اس کے درجات بہت بلند کر دیتا ہے۔ اسی طرح بندہ اللہ کی ناراضگی کی ایک بات کہتا ہے اور اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتا مگر اس کی وجہ سے وہ جہنم میں جا گرتا ہے۔

ایک معاملہ میں دو قسم کے کلام کی ایک مثال وہ ہے جو غزوۂ بنی مصطلق (۶ ھ) کے موقع پر پیش آئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھیں۔ ایک اتفاقی سبب سے وہ قافلہ سے بچھڑ گئیں اور بعد کو صفوان بن معطل کے ساتھ مدینہ آئیں۔ اس طرح کے واقعات قدیم صحرائی زندگی میں غیر معمولی نہ تھے۔ مگر اس سادہ سے واقعہ کو عبد اللہ بن ابی نے، جو رسول اللہ کو بدنام کرنے کے لئے موقع کی تلاش میں رہتا تھا، غلط رنگ دیا اور حضرت عائشہ کو صفوان کے ساتھ ملوث کر کے آپ کی عزت و عصمت پر حملے کئے۔ قرآن میں ہے کہ اس کی وجہ سے عبد اللہ بن ابی عذاب عظیم کا مستحق ہو گیا (نور ۱۱)

اس واقعہ کی بے ضرر توجیہہ بھی ہو سکتی تھی۔ مگر اس نے اس واقعہ سے افک (جھوٹ) کی غذا لی۔ اس نے کہا: "عائشہ رضا کا قافلہ سے بچھڑنا اور پھر ایک غیر مرد کے اونٹ میں بیٹھ کر واپس آنا محض اتفاقیہ نہیں ہو سکتا" اس قسم کی کوئی بات جو کسی پاک دامن خاتون کے کردار کو مشتبہ کرے اللہ کی نظر میں جرم عظیم کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایسا ایک جملہ بھی آدمی کو جہنم میں گرا دینے کے لئے کافی ہے۔

ایسے مواقع پر صحیح اسلامی طریقہ یہ ہے کہ آدمی اس سے ظن خیر کی غذا لے۔ وہ اپنی آبرو پر دوسرے کی آبرو کو قیاس کرے۔ اس کی ایک مثال حضرت ابو ایوب (خالد بن زید انصاری) کا واقعہ ہے۔ جب یہ قصہ پھیلا تو ان کی بیوی نے کہا: اے ابو ایوب، کیا آپ نے نہیں سنا کہ عائشہ کے بارے میں لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا ہاں۔ مگر وہ جھوٹ ہے۔ اے ام ایوب، کیا تم ایسا کرو گی۔ انھوں نے کہا خدا کی قسم نہیں، میں کبھی ایسا نہیں کر سکتی۔ ابو ایوب انصاری نے کہا: پھر عائشہ خدا کی قسم تم سے بہتر ہیں (ان ابا ایوب قالت لہ امرأتہ ام ایوب۔ یا ابا ایوب، الا تسمع ما یقول الناس فی عائشۃ۔ قال بلی وذلک الکذب۔ اکنت یا ام ایوب

فاعلة۔ قالت لا واللہ ما کنتُ لا فعلہ۔ قال فعائشۃ واللہ خیر منک، سیرت ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۳۴۷)

قرآن میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

لولا اذ سمعتموہ ظن المومنون والمومنات	ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ بات سنی تو مسلمان مردوں
بانفسھم خیرا وقالوا ھذا افک مبین	اور مسلمان عورتوں نے اپنے لوگوں کی بابت اچھا گمان کیا ہوتا
(نور ۱۲)	اور کہتے کہ یہ تو ایک کھلا ہوا بہتان ہے۔

جب کسی کے متعلق کوئی بات سامنے آئے تو ہمیشہ اس کو اچھے مفہوم میں لینے کی کوشش کرنا چاہیے۔ انسانی زندگی کا معاملہ ایک بے حد پیچیدہ معاملہ ہے۔ کسی انسانی واقعہ کو بخوبی طور پر سمجھنے کے لیے بہت سی چیزوں کے بارے میں قطعی معلومات ضروری ہیں جو عام طور پر ایک آدمی کو حاصل نہیں ہوتیں۔ کسی انسانی واقعہ کے بہت سے اجزاء ہوتے ہیں۔ ایک ہی واقعہ کو ناکافی معلومات کی روشنی میں دیکھا جائے تو کچھ نظر آتا ہے اور کافی معلومات کی روشنی میں دیکھا جائے تو کچھ۔ بیشتر حالات میں کسی شخص کے سامنے واقعہ کے تمام اجزاء نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ جلد رائے قائم کرنے والا اکثر غلط رائے قائم کرتا ہے۔ پھر کوئی آدمی کیوں غیر ضروری طور پر اپنے کو آزمائش میں ڈالے۔ وہ کیوں ایسی بات کہے جس کو وہ سچائی کی عدالت میں صحیح ثابت نہ کر سکتا ہو۔

اسلامی معاشرہ خدا سے ڈرنے والوں کا معاشرہ ہوتا ہے۔ ایسے معاشرہ میں ہر آدمی کی زبان پر اللہ کے ڈر کی لگام لگی ہوئی ہوتی ہے۔ اور جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہوں وہ دوسرے کے بارے میں کبھی بدخواہی کا کلمہ نہیں کہہ سکتے۔ جو آدمی اس پر یقین رکھتا ہو کہ بالآخر سارے معاملات خدا کے یہاں پیش ہونے والے ہیں وہ دوسرے کے بارے میں کوئی بات زبان سے نکالتے ہوئے فوراً یہ سوچتا ہے کہ میری بات اگر خدا کے یہاں بے دلیل ٹھہرے تو میں کیا کروں گا۔ ایسا آدمی دوسروں کے ساتھ کبھی ایسا رویہ اختیار نہیں کرتا جو اس کو خدا کے یہاں بے قیمت کر دینے والا ہو۔ کسی آدمی کے ساتھ برا سلوک کرتے ہوئے وہ اس طرح ڈرنے لگتا ہے جیسے اس آدمی کے ساتھ خود خدا کھڑا ہوا ہو۔

خدا سے ڈرنے والا آدمی نہ صرف یہ کہ دوسرے کے خلاف کوئی بات کہنے میں بے حد محتاط ہوتا ہے بلکہ جب وہ دیکھتا ہے کہ کوئی شخص ایک مسلمان کو بے آبرو کر رہا ہے تو وہ اس مسلمان کی طرف سے مدافعت کرنے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ مظلوم کے حق میں غیر جانب دار نہیں رہتا بلکہ وہ اس کا طرف دار بن جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اپنے بھائی کی عزت و آبرو کا محافظ سمجھتا ہے۔ وہ جب کسی کو دیکھتا ہے کہ وہ دوسرے کی بے آبروئی کر رہا ہے تو وہ کہہ اٹھتا ہے —— ھذا افک مبین

ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا ۔ نوح نے کہا اے میری قوم، اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔ میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ اس کی قوم کے بڑوں نے کہا کہ ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم ایک کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہو۔ نوح نے کہا کہ اے میری قوم، مجھ میں کوئی گمراہی نہیں ہے۔ بلکہ میں بھیجا ہوا ہوں سارے عالم کے پروردگار کا۔ تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچا رہا ہوں اور تمھاری خیر خواہی کر رہا ہوں۔ اور میں اللہ کی طرف سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ کیا تم کو اس پر تعجب ہوا کہ تمھارے رب کی نصیحت تمھارے پاس تمھیں میں سے ایک شخص کے ذریعہ آئی تاکہ وہ تم کو ڈرائے اور تاکہ تم بچو اور تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ پس انھوں نے اس کو جھٹلا دیا۔ پھر ہم نے نوح کو بچا لیا اور ان لوگوں کو بھی جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے اور ہم نے ان لوگوں کو ڈبو دیا جنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا۔ بے شک وہ لوگ اندھے تھے ۶۴ - ۵۹

حضرت آدم کے بعد تقریباً ایک ہزار سال تک تمام اولاد آدم توحید پر قائم تھی۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ اس کے بعد لوگوں نے اپنے اکابر اسلاف کی شکلیں بنانا شروع کیں تاکہ ان کے احوال و عبادات کی یاد تازہ رہے۔ ان بزرگوں کے نام وُد، سواع، یغوث، یعوق، نسر تھے۔ دھیرے دھیرے ان بزرگوں نے ان کے درمیان معبود کا درجہ حاصل کر لیا۔ یہ لوگ قدیم عراق میں آباد تھے۔ جب بگاڑ اس نوبت کو پہنچا تو اللہ نے ان کی اصلاح کے لئے حضرت نوح کو پیغمبر بنا کر ان کی طرف بھیجا۔ مگر انھوں نے حضرت نوح کو ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ تقویٰ کی روش اختیار کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

اس انکار کی وجہ قرآن کے بیان کے مطابق یہ تھی کہ ان کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو گیا کہ ایک آدمی جو دیکھنے میں انھیں جیسا ہے وہ خدا کی طرف سے خدا کا پیغام پہنچانے کے لئے چنا گیا ہے۔ وہ اپنے کو جن اکابر کے دین پر سمجھتے تھے ان کے مقابلہ میں حضرت نوح ان کو بہت معمولی آدمی دکھائی دیتے تھے۔ ان قدیم اکابر کی عظمت صدیوں کی تاریخ سے مسلّم ہو چکی تھی۔ اس کے مقابلہ میں حضرت نوح ایک معاصر شخص تھے۔ ان کے نام کے ساتھ تاریخی عظمتیں جمع نہیں ہوئی تھیں۔ چنانچہ قوم نے آپ کا انکار کر دیا۔ انھوں نے وقت کے پیغمبر کو احمق اور گمراہ کہنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ کیوں کہ ان کے خیال کے مطابق آپ اکابر کے دین سے منحرف ہو گئے تھے۔ حضرت نوح کی خیر خواہی، ان کے ساتھ دلائل کا زور، ان کا راہ حق پر قائم ہونا، کوئی بھی چیز قوم کو متاثر نہ کر سکی۔

حضرت نوح کی طرف سے اتمام حجت کے بعد قوم غرق کر دی گئی۔ اس غرقابی کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے خدا کی نشانیوں کو جھٹلایا۔ انھوں نے چاہا کہ "معمولی شخصیت" کے بجائے کسی "مسلمہ شخصیت" کے ذریعہ انھیں خدا کا پیغام پہنچایا جائے۔ مگر خدا کی نظر میں یہ اندھا پن تھا۔ خدا نے آدمی کو بصیرت اس لئے دی ہے کہ وہ "نشانی" کے روپ میں حق کو پہچان لے نہ کہ حسی مظاہرہ کی صورت میں۔ جو لوگ نشانی کے روپ میں حق کو نہ پہچانیں وہ خدا کی نظر میں آنکھ رکھتے ہوئے بھی اندھے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے خدا کی رحمت میں کوئی حصہ نہیں۔

اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ انھوں نے کہا اے میری قوم، اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔ سو کیا تم ڈرتے نہیں۔ اس کی قوم کے بڑے جو انکار کر رہے تھے بولے، ہم تو تم کو بے عقلی میں مبتلا دیکھتے ہیں اور ہم کو گمان ہے کہ تم جھوٹے ہو۔ ہود نے کہا کہ اے میری قوم، مجھے کچھ بے عقلی نہیں۔ بلکہ میں خداوند عالم کا رسول ہوں۔ تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچا رہا ہوں اور تمھارا خیر خواہ اور امین ہوں۔ کیا تم کو اس پر تعجب ہے کہ تمھارے پاس تمھیں میں سے ایک شخص کے ذریعہ تمھارے رب کی نصیحت آئی تاکہ وہ تم کو ڈرائے۔ اور یاد کرو جب کہ اس نے قوم نوح کے بعد تم کو اس کا جانشین بنایا اور ڈیل ڈول میں تم کو پھیلاو بھی زیادہ دیا۔ پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ ۶۵-۶۹

حضرت نوح کی کشتی میں جو اہل ایمان بچے تھے ان میں آپ کے پوتے اِرَم کی اولاد سے ایک نسل چلی۔ وہ قدیم یمن میں آباد تھے اور عاد کہلاتے تھے۔ یہ لوگ ابتداءً حضرت نوح کے دین پر تھے۔ بعد کو جب ان میں بگاڑ پیدا ہوا تو اللہ نے حضرت ہود کو ان کے اوپر اپنا پیغمبر مقرر کیا۔ مگر قوم کے سرداروں کو آپ کے اندر وہ عظمت نظر نہ آئی جو ان کے خیال کے مطابق خدا کے پیغمبر کے اندر ہونا چاہئے تھی۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ شخص یا تو احمق ہے یا پھر وہ جھوٹا دعویٰ کر رہا ہے۔

"میں تمھارا ناصح اور امین ہوں" پیغمبر کی زبان سے یہ فقرہ بتاتا ہے کہ داعی اور مدعو کا رشتہ قومی حریف یا سیاسی مدمقابل جیسا رشتہ نہیں ہے۔ یہ خیر خواہی اور امانت داری کا رشتہ ہے۔ داعی کو ایسا ہونا چاہئے کہ اس کے دل میں مدعو کے لئے خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ مدعو کی طرف سے خواہ کیسا ہی ناخوش گوار رویہ سامنے آئے مگر داعی آخر وقت تک مدعو کا خیر خواہ بنا رہے۔ پھر جو پیغام وہ دے رہا ہے اس کو دیتے ہوئے اس کے اندر یہ احساس نہ ہو کہ یہ میری کوئی اپنی چیز ہے جو میں دوسروں کو عطا کر رہا ہوں۔ بلکہ یہ جذبہ ہو کہ یہ خود دوسروں کی چیز ہے۔ یہ دوسروں کے لئے خدا کی امانت ہے جو میں ان کو پہنچا کر بری الذمہ ہو رہا ہوں۔

پیغمبروں کی دعوت کی بنیاد ہمیشہ یہ رہی ہے کہ وہ انسان کے اوپر خدا کی نعمتیں یاد دلائیں اور اس کو اس بات سے ڈرائیں کہ اگر وہ خدا کا شکر گزار بن کر نہ رہا تو وہ خدا کی پکڑ میں آجائے گا۔ قومی جھگڑوں اور مادی مسائل کو پیغمبر کبھی اپنی دعوت کا عنوان نہیں بناتے۔ وہ آخری حد تک اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے اور مدعو کے درمیان اصل دعوت کے سوا کوئی چیز بحث کی بنیاد نہ بننے پائے، قوم ان کو صرف توحید اور آخرت کے داعی کے روپ میں دیکھے نہ کہ کسی اور روپ میں۔

"خدا کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کی نعمتوں کا استحقاق اُس کے لئے ہے جس نے دنیا میں خدا کی نعمتوں کا اعتراف کیا ہو۔ جنت خدا کے منعم و محسن ہونے کا سب سے بڑا اظہار ہے۔ اس لئے آخرت کی جنت کو وہی پائے گا جس نے دنیا میں خدا کے منعم و محسن ہونے کی حیثیت کو پالیا ہو۔ یہی معرفت جنت کی اصل قیمت ہے۔

ہود کی قوم نے کہا، کیا تم ہمارے پاس اس لئے آئے ہو کہ ہم تنہا اللہ کی عبادت کریں اور ان کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں۔ پس تم جس عذاب کی دھمکی ہم کو دیتے ہو اس کو لے آؤ اگر تم سچے ہو۔ ہود نے کہا تم پر تمھارے رب کی طرف سے ناپاکی اور غصہ واقع ہو چکا ہے۔ کیا تم مجھ سے ان ناموں پر جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں۔ جن کی خدا نے کوئی سند نہیں اتاری۔ پس انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔ پھر ہم نے بچا لیا اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے اپنی رحمت سے اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جو ہماری نشانیوں کو جھٹلاتے تھے اور مانتے نہ تھے ۷۲-۷۰

انسان ناموں کے ذریعہ کسی چیز کا تصور قائم کرتا ہے۔ کسی شخص کے ساتھ اچھا لفظ لگ جائے تو وہ اچھا معلوم ہوتا ہے اور اگر برا لفظ لگ جائے تو برا دکھائی دینے لگتا ہے۔ خدا کے سوا دوسری چیزیں یا ہستیاں جو آدمی کی توجہات کا مرکز بنتی ہیں اس کی وجہ بھی یہی نام ہوتے ہیں۔ لوگ کسی شخصیت کو غوث پاک، گنج بخش، غریب نواز، مشکل کشا جیسے الفاظ سے پکارنے لگتے ہیں۔ یہ الفاظ دھیرے دھیرے ان شخصیتوں کے ساتھ ایسا وابستہ ہو جاتے ہیں کہ لوگ یقین کر لیتے ہیں کہ جس کو غوث (فریادرس) کہا جاتا ہے وہ واقعی فریاد کو پہنچنے والا ہے اور جس کو مشکل کشا کے نام سے پکارا جاتا ہے سچ مچ وہ مشکلوں کو حل کرنے والا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے تمام نام صرف انسانوں کے رکھے ہوئے ہیں۔ ان ناموں کا کوئی مسمّیٰ کہیں موجود نہیں۔ ان کے حق میں نہ کوئی شرعی دلیل ہے اور نہ کوئی عقلی دلیل۔

ناموں کی شریعت کی ایک قسم وہ ہے جو جاہل انسانوں کے درمیان رائج ہے۔ تاہم اس کی ایک زیادہ مہذب صورت بھی ہے جو پڑھے لوگوں کے درمیان مقبول ہے۔ یہاں بھی کچھ شخصیتوں کے ساتھ کچھ غیر معمولی الفاظ وابستہ کر دئے جاتے ہیں، مثلاً قدسی صفات، محبوب خدا، ستون اسلام، نجات دہندہ ملت وغیرہ۔ اس قسم کے الفاظ دھیرے دھیرے مذکورہ شخصیتوں کے نام کا جزء بن جاتے ہیں۔ لوگ ان شخصیتوں کو ویسا ہی غیر معمولی سمجھ لیتے ہیں جیسا کہ ان کو دئے ہوئے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔

جو چیز "باپ دادا" سے چلی آرہی ہو، بالفاظ دیگر جس نے تاریخی اہمیت حاصل کر لی ہو اور طویل روایات کے نتیجہ میں جس کے ساتھ ماضی کا تقدس شامل ہو گیا ہو وہ لوگوں کی نظر میں ہمیشہ عظیم ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں "آج" کے داعی کی بات ہلکی دکھائی دیتی ہے۔ وہ حال کے داعی کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کو اعتماد ہوتا ہے کہ وہ اسلاف کی عظمتوں کے وارث ہیں پھر کون ان کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔

خدا کے معاملہ میں ڈھٹائی آدمی کو دھیرے دھیرے بے حس بنا دیتی ہے۔ وہ اس قابل نہیں رہتا کہ وہ نصیحت اور یاد دہانی کی زبان میں کوئی اصلاح قبول کر سکے۔ ایسے لوگ گویا اس بات کے منتظر ہیں کہ خدا عذاب کی زبان میں ان کے سامنے ظاہر ہو

اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ انھوں نے کہا اے میری قوم، اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک کھلا ہوا نشان آگیا ہے۔ یہ اللہ کی اونٹنی تمھارے لئے ایک نشانی کے طور پر ہے۔ بس اس کو چھوڑ دو کہ وہ کھائے اللہ کی زمین میں۔ اور اس کو کوئی گزند نہ پہنچانا ورنہ تم کو ایک دردناک عذاب پکڑ لے گا۔ اور یاد کرو جب کہ خدا نے عاد کے بعد تم کو ان کا جانشین بنایا اور تم کو زمین میں ٹھکانا دیا، تم اس کے میدانوں میں محل بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو۔ پس اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد کرتے نہ پھرو ۷۴ - ۷۳

قوم عاد کی تباہی کے بعد اس کے صالح افراد عرب کے شمال مغرب میں حجر کے علاقہ میں آباد ہوئے۔ ان کی نسل بڑھی اور انھوں نے زراعت اور تعمیرات میں بڑی ترقیاں کیں۔ انھوں نے میدانوں میں محل بنائے اور پہاڑوں کو تراش کر ان کو بڑے بڑے حجری مکانات کی صورت دے دی۔ بعد کو ان میں وہ خرابیاں پیدا ہو گئیں جو مادی ترقی اور دنیوی خوش حالی کے ساتھ قوموں میں پیدا ہوتی ہیں۔ عیش پرستی، آخرت فراموشی، حدود اللہ سے بے پروائی، اللہ کی بڑائی کو بھول کر اپنی بڑائی قائم کرنا۔ اس وقت اللہ نے حضرت صالح کو کھڑا کیا تاکہ وہ ان کو اللہ کی پکڑ سے ڈرائیں۔ مگر انھوں نے نصیحت قبول نہ کی۔ وہ اپنے فساد کو صلاح میں بدلنے پر راضی نہ ہوئے۔ جس کائنات میں تمام چیزیں خدا کی تابع بن کر رہ رہی ہیں وہاں انھوں نے خدا کا سرکش بن کر رہنا چاہا۔ جہاں ہر چیز اپنی حد کے اندر اپنا عمل کرتی ہے وہاں انھوں نے اپنی حد سے تجاوز کر کے زندہ رہنا چاہا۔ یہ ایک اصلاح یافتہ دنیا میں فساد پھیلانا تھا۔ چنانچہ ان کو دنیا میں بسنے کے نااہل قرار دے دیا گیا۔

قوم ثمود کو جانچنے کے لئے خدا نے ایک اونٹنی مقرر کی اور کہا کہ اس کو تکلیف نہ پہنچانا ورنہ ہلاک کر دیے جاؤ گے۔ خدا کے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ان کے لئے ایک خوفناک شیر مقرر کر دے۔ مگر خدا نے شیر کے بجائے اونٹنی کو مقرر فرمایا۔ اس کا راز یہ ہے کہ آدمی کی خدا ترسی کا امتحان ہمیشہ "اونٹنی" کی سطح پر لیا جاتا ہے نہ کہ "شیر" کی سطح پر۔ سماج میں ہمیشہ کچھ ناقۃ اللہ (خدا کی اونٹنی) جیسے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ وہ کم زور افراد ہیں جن کے ساتھ وہ مادی زور نہیں ہوتا جو لوگوں کو ان کے خلاف کارروائی کرنے سے روکے۔ جن کے ساتھ حسن سلوک کا محرک صرف اخلاقی احساس ہوتا ہے نہ کہ کوئی ڈر۔ مگر یہی وہ لوگ ہیں جن کی سطح پر لوگوں کی خدا پرستی جانچی جا رہی ہے۔ یہی وہ افراد ہیں جن کے ذریعہ کسی کو جنت کا سرٹیفکٹ دیا جا رہا ہے اور کسی کو جہنم کا۔

ثمود نے فن تعمیر میں کمال پیدا کیا۔ متعلقہ علوم مثلاً ریاضی، ہندسہ، انجینئرنگ میں بھی یقیناً انھوں نے ضروری دستگاہ حاصل کی ہوگی ورنہ یہ ترقیات ممکن نہ ہوتیں۔ مگر ان کو جس بات کا مجرم ٹھہرایا گیا وہ ان کی مادی ترقیاں نہیں تھیں بلکہ زمین میں فساد پھیلانا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جائز حدود میں ترقی کرنے سے خدا نہیں روکتا۔ البتہ زندگی کے معاملات میں آدمی کو اس نظام اصلاح کا پابند رہنا چاہیے جو خدا نے پوری کائنات میں قائم کر رکھا ہے۔

ان کی قوم کے بڑے جنھوں نے گھمنڈ کیا، ان مومنین سے بولے جو ناتوان گنے جاتے تھے، کیا تم کو یقین ہے کہ صالح اپنے رب کے بھیجے ہوئے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم تو جو وہ لے کر آئے ہیں اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ متکبر لوگ کہنے لگے کہ ہم تو اس چیز کے منکر ہیں جس پر تم ایمان لائے ہو۔ پھر انھوں نے اونٹنی کو کاٹ ڈالا اور اپنے رب کے حکم سے پھر گئے۔ اور انھوں نے کہا، اے صالح اگر تم پیغمبر ہو تو وہ عذاب ہم پر لے آؤ جس سے تم ہم کو ڈراتے تھے۔ پھر انھیں زلزلہ نے آپکڑا اور وہ اپنے گھر میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔ اور صالح یہ کہتا ہوا ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ اے میری قوم، میں نے تم کو اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور میں نے تمھاری خیر خواہی کی مگر تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے

۷۵ — ۷۹

پیغمبر جب آتا ہے تو اپنے زمانہ میں وہ ایک متنازعہ شخصیت ہوتا ہے نہ کہ ثابت شدہ شخصیت۔ مزید یہ کہ اس کے ساتھ دنیا کی رونقیں جمع نہیں ہوتیں، وہ دنیا کی گدیوں میں سے کسی گدی پر بیٹھا ہوا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ پیغمبر کے معاصر ہوتے ہیں وہ پیغمبر کے پیغمبر ہونے کو سمجھ نہیں پاتے اور اس کا انکار کر دیتے ہیں۔ ان کو یقین نہیں آتا کہ وہ شخص جس کو ہم صرف ایک معمولی آدمی کی حیثیت سے جانتے ہیں وہی وہ شخص ہے جس کو خدا نے اپنے پیغام کی پیغام رسانی کے لئے چنا ہے۔

"ہم صالح کے پیغام (بما ارسل بہ) پر ایمان لائے ہیں"، حضرت صالح کے ساتھیوں کا یہ جواب بتاتا ہے کہ ان میں اور دوسروں میں کیا فرق تھا۔ منکرین نے حضرت صالح کی شخصیت کو دیکھا اور مومنین نے آپ کے اصل پیغام کو۔ منکروں کو حضرت صالح کی شخصیت میں ظاہری عظمت دکھائی نہ دی، انھوں نے آپ کو نظر انداز کر دیا۔ اس کے برعکس مومنین نے حضرت صالح کے پیغام میں حق کے دلائل اور سچائی کی جھلکیاں دیکھ لیں، وہ فوراً ان کے ساتھی بن گئے۔ سچائی ہمیشہ دلائل کے زور پر ظاہر ہوتی ہے نہ کہ دنیوی عظمتوں کے زور پر۔ جو لوگ دلائل کے روپ میں حق کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ فوراً اس کو پالیتے ہیں۔ اور جو لوگ ظاہری بڑائیوں میں اٹکے ہوئے ہوں وہ مشتبہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ انھیں کبھی حق کا ساتھ دینے کی توفیق حاصل نہیں ہوتی۔

حضرت صالح کی اونٹنی کو مارنے والا اگرچہ قوم کا ایک سرکش آدمی تھا۔ مگر یہاں اس کو پوری قوم کی طرف منسوب کرتے ہوئے فرمایا "ان لوگوں نے اونٹنی کو ہلاک کر دیا"۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی گروہ کا ایک شخص برا عمل کرے اور دوسرے لوگ اس کے برے فعل پر راضی رہیں۔ تو سب کے سب اس مجرمانہ فعل میں شریک قرار دے دیے جاتے ہیں۔

جو قوم خواہش پرستی کا شکار ہو اس کو حقیقت پسندی کی باتیں اپیل نہیں کرتیں۔ وہ ایسے شخص کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہوتی جو اس کو سنجیدہ عمل کی طرف بلاتا ہو۔ اس کے برعکس جو لوگ خوش نما الفاظ بولیں اور جھوٹی امیدوں کی تجارت کریں۔ ان کے گرد بھیڑ کی بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔ سچے خیر خواہ کے لئے اس کے اندر کوئی کشش نہیں ہوتی۔ البتہ ان لوگوں کی طرف وہ تیزی سے دوڑ پڑتی ہے جو اس کا استحصال کرنے کے لئے اٹھے ہوں۔

اور ہم نے لوط کو بھیجا۔ جب اس نے اپنی قوم سے کہا۔ کیا تم کھلی بے حیائی کا کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا۔ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے ہو۔ بلکہ تم حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔ مگر اس کی قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھیں اپنی بستی سے نکال دو۔ یہ لوگ بڑے پاک باز بنتے ہیں۔ پھر ہم نے بچا لیا لوط کو اور اس کے گھر والوں کو، اس کی بیوی کے سوا جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے بنی۔ اور ہم نے ان پر بارش برسائی پتھروں کی، پھر دیکھو کہ کیسا انجام ہوا مجرموں کا ۸۴ — ۸۰

حضرت لوط حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ وہ جس قوم کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجے گئے وہ دریائے اردن کے کنارے جنوبی شام کے علاقہ میں آباد تھی۔ اس قوم کی خوش حالی اس کو عیش پرستی کی طرف لے گئی۔ حتیٰ کہ ان لوگوں کی بے راہ روی اتنی بڑھ گئی کہ انھوں نے اپنی شہوانی خواہشات کی تسکین کے لئے ہم جنسی کے طریقے کو اختیار کر لیا۔ پیغمبر نے ان کو اس کھلی ہوئی بے حیائی سے ڈرایا۔

کائنات کے لئے فطرت کی ایک اسکیم ہے۔ اس اسکیم کو قرآن میں اصلاح کہا گیا ہے۔ اس اصلاح کے خلاف چلنے کا نام فساد ہے۔ کائنات کی تمام چیزیں اسی اصلاحی راستہ پر چل رہی ہیں۔ یہ صرف انسان ہے جو اپنی آزادی کا غلط فائدہ اٹھاتا ہے اور فطرت کے راستہ کے خلاف اپنا راستہ بناتا ہے۔ حضرت لوط کی قوم اسی قسم کے ایک فساد میں مبتلا تھی۔ جنسی تعلق کا فطری طریقہ یہ ہے کہ عورت مرد باہم بیوی اور شوہر بن کر رہیں۔ یہ اصلاح کے طریقہ پر چلنا ہے۔ اس کے برعکس اگر یہ ہو کہ مرد مرد یا عورت عورت کے درمیان جنسی تعلقات قائم کئے جانے لگیں تو یہ خدا کی مقرر کی ہوئی حد سے گزر جانا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو قرآن میں فساد کہا گیا ہے۔

حضرت لوط پر صرف ان کے قریبی لوگوں میں سے چند افراد ایمان لائے۔ باقی پوری قوم اپنی ہوس پرستی میں غرق رہی۔ انھوں نے کہا "جب یہ ہم سب لوگوں کو گندہ سمجھتے ہیں اور خود پاک بننا چاہتے ہیں تو گندوں میں پاکوں کا کیا کام۔ پھر تو یہ نکل جائیں ہمارے شہر سے"، ان کا یہ قول دراصل گھمنڈ کا قول تھا۔ ان کو یہ کہنے کی جرأت اس لئے ہوئی کہ وہ اپنی اکثریت اور مادی تفوق کی وجہ سے اپنے کو محفوظ حالت میں سمجھتے تھے۔ گھمنڈ کی نفسیات میں مبتلا لوگ ہمیشہ اپنے کمزور پڑوسیوں سے کہتے ہیں کہ جن لوگوں کو ہمارا طریقہ پسند نہیں وہ ہماری زمین کو چھوڑ دیں۔ مگر یہ خدا کی دنیا میں شرک کرنا ہے اور شرک سب سے بڑا جرم ہے۔

حضرت لوط کی قوم پر خدا کا عذاب آیا تو عذاب کا شکار ہونے والوں میں پیغمبر کی بیوی بھی شامل تھیں۔ اس سے انعام اور سزا کے باب میں خدا کا بے لاگ انصاف ظاہر ہوتا ہے۔ خدا کے انصاف کے ترازو میں رشتوں اور دوستیوں کا کوئی لحاظ نہیں۔ خدا کا فیصلہ اتنا بے لاگ ہے کہ اس نے حضرت نوح کے بیٹے، حضرت ابراہیم کے باپ، حضرت لوط کی بیوی اور حضرت محمدؐ کے چچا کو بھی معاف نہیں کیا۔ اور دوسری طرف فرعون کی بیوی نے صالح عمل کا ثبوت دیا تو اس کو جنت میں داخل کر دیا۔

اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اس نے کہا اے میری قوم، اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی تمھارا معبود نہیں۔ تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے دلیل پہنچ چکی ہے۔ پس ناپ اور تول پوری کرو۔ اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں۔ اور فساد نہ ڈالو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد۔ یہ تمھارے حق میں بہتر ہے اگر تم مومن ہو۔ اور راستوں پر مت بیٹھو کہ ڈراؤ اور اللہ کی راہ سے ان لوگوں کو روکو جو اس پر ایمان لا چکے ہیں اور اس راہ میں کجی تلاش کرو۔ اور یاد کرو جب کہ تم بہت تھوڑے تھے پھر تم کو بڑھا دیا۔ اور دیکھو فساد کرنے والوں کا انجام کیا ہوا۔ اور اگر تم میں سے ایک گروہ اس پر ایمان لایا ہے جو دے کر میں بھیجا گیا ہوں اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا ہے تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہ بہتر فیصلہ کرنے والا ہے ۸۷-۸۵

حضرت ابراہیم کے ایک صاحب زادہ مدیان تھے جو آپ کی تیسری بیوی قطورہ سے پیدا ہوئے۔ اہل مدین انھیں کی نسل سے تھے۔ یہ قوم بحر احمر کے عرب ساحل پر آباد تھی۔ یہ لوگ خدا کو ماننے والے تھے اور اپنے کو دین ابراہیمی کا حامل سمجھتے تھے۔ مگر حضرت ابراہیم کے پانچ سو سال بعد ان کے اندر بگاڑ آگیا۔ یہ ایک تجارت پیشہ قوم تھی اور اس کے بگاڑ کا سب سے زیادہ اظہار اسی پہلو سے ہوا۔ وہ ناپ تول اور لین دین میں دیانت داری کے اصولوں پر پوری طرح قائم نہیں رہے۔

دوسرے سے معاملہ کرنے میں بے انصافی خدا کے قائم کردہ نظام اصلاح کے خلاف ہے۔ خدا نے اپنی دنیا کا نظام کامل انصاف پر قائم کیا ہے۔ یہاں کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو لیتے وقت دوسرے سے زیادہ لے اور دیتے وقت دوسرے کو کم دے۔ یہاں ہر چیز حسابی صحت کی حد تک انصاف کے اصول پر قائم ہے۔ ایسی حالت میں انسان کو بھی وہی کرنا چاہیے جو اس کے گرد و پیش کی ساری کائنات کر رہی ہے۔ ایسا نہ کرنا خدا کی اصلاح یافتہ دنیا میں فساد برپا کرنا ہے۔

اہل مدین کا معاملاتی بگاڑ جب بہت بڑھ گیا تو خدا نے حضرت شعیب کو ان کی طرف اپنا پیغام لے کر بھیجا۔ آپ نے ان کو بتایا کہ معاملات میں راستی اور دیانت داری کا طریقہ اختیار کرو۔ آپ نے کھلے کھلے دلائل کے ذریعہ ان کو آخری حد تک باخبر کر دیا۔ مگر وہ نصیحت قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ حتیٰ کہ ان کا حال یہ ہوا کہ خود حضرت شعیب کی دعوت کو مٹانے پر تل گئے۔ وہ آپ کی باتوں میں طرح طرح کے شوشے نکال کر لوگوں کو آپ کے بارے میں غلط فہمی میں ڈالتے۔ وہ جارحانہ کارروائیوں کے ذریعہ کوشش کرتے کہ لوگ آپ کا ساتھ نہ دیں۔ بالآخر ان پر خدائی عذاب آیا اور وہ تباہ کر دئے گئے۔ بندوں کے حقوق کی رعایت اور باہمی معاملات کی درستگی خدا کی نظر میں اتنی زیادہ اہم ہے کہ اس کی مخالفت پر ایک قوم، ایمان کی دعوے دار ہونے کے باوجود تباہ کر دی گئی۔ خدا بہتر فیصلہ کرنے والا ہے اور بہتر فیصلہ جانب داری کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ یہ ممکن نہیں کہ خدا بے کلمہ والوں کو ان کی بے انصافی پر پکڑے اور کلمہ والوں کو ٹھیک اسی بے انصافی پر چھوڑ دے۔

قوم کے بڑے جو متکبر تھے انھوں نے کہا کہ اے شعیب ہم تم کو اور ان لوگوں کو جو تمھارے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے یا تم ہماری ملت میں پھر آجاؤ۔ شعیب نے کہا، کیا ہم بیزار ہوں تب بھی۔ ہم اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے ہوں گے اگر ہم تمھاری ملت میں لوٹ آئیں بعد اس کے کہ اللہ نے ہم کو اس سے نجات دی۔ اور ہم سے یہ ممکن نہیں کہ ہم اس ملت میں لوٹ آئیں مگر یہ کہ خدا ہمارا رب ہی ایسا چاہے۔ ہمارا رب ہر چیز کو اپنے علم سے گھیرے ہوئے ہے۔ ہم نے اپنے رب پر بھروسہ کیا۔ اے ہمارے رب، ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دے، تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ اور ان بڑوں نے جنھوں نے اس کی قوم میں سے انکار کیا تھا کہا کہ اگر تم شعیب کی پیروی کرو گے تو تم برباد ہو جاؤ گے۔ پھر ان کو زلزلہ نے پکڑ لیا۔ پس وہ اپنے گھر میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔ جنھوں نے شعیب کو جھٹلایا تھا گویا وہ کبھی اس بستی میں بسے ہی نہ تھے، جنھوں نے شعیب کو جھٹلایا وہی گھاٹے میں رہے۔ اس وقت شعیب ان سے منھ موڑ کر چلا اور کہا، اے میری قوم میں تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچا چکا اور تمھاری خیر خواہی کر چکا۔ اب میں کیا افسوس کروں منکروں پر ۹۳-۸۸

حضرت شعیب کی قوم خدا کے انکار کی مجرم نہ تھی بلکہ خدا پر افترا کرنے کی مجرم تھی۔ یعنی اس نے خدا کی طرف ایک ایسے دین کو منسوب کر رکھا تھا جس کو خدا نے ان کے لئے اتارا نہ تھا۔ یہی تمام انبیاء کی قوموں کا حال رہا ہے۔ انبیاء کی قومیں سب وہی تھیں جن پر اس سے پہلے خدا نے اپنا دین اتارا تھا مگر بعد کو انھوں نے خود ساختہ تبدیلیوں اور اضافوں کے ذریعہ اس کو کچھ سے کچھ کر دیا۔ انھوں نے خدا کے دین کو اپنی خواہشات کا دین بنا ڈالا اور اسی کو خدا کا دین کہنے لگے۔

وقت کے قائم شدہ دین میں جن لوگوں کو عزت اور بڑائی کا مقام ملا ہوا تھا انھوں نے محسوس کیا کہ دلیل کے اعتبار سے ان کے پاس پیغمبر کی باتوں کا توڑ نہیں ہے۔ تاہم اقتدار کے ذرائع سب انھیں کے پاس تھے۔ انھوں نے دلیل کے میدان میں اپنے کو لاجواب پا کر یہ چاہا کہ زور و قوت کے ذریعہ وہ پیغمبر کو خاموش کر دیں۔ انھوں نے پیغمبر کے ساتھیوں کو اس نازک صورت حال کی یاد دلائی کہ وقت کے نظام میں زندگی کے تمام سرے انھیں لوگوں کے پاس ہیں جن کو وہ باطل ٹھہرا رہے ہیں۔ یہ باطل لوگ اگر ان کے خلاف متحرک ہو جائیں تو اس کے بعد وہ زندگی کے ذرائع کہاں پائیں گے۔ مگر وہ بھول گئے کہ خدا ان سے بھی زیادہ طاقت ور ہے۔ اور خدا جس کے خلاف ہو جائے اس کے لئے کہیں جائے پناہ نہیں۔

کسی شخص کے لئے صرف اس وقت تک چھوٹ ہے جب تک اس پر امر حق واضح نہ ہوا ہو۔ امر حق جب بخوبی طور پر واضح ہو جائے اور اس کے بعد بھی آدمی سرکشی کرے تو وہ ہمدردی کا استحقاق کھو دیتا ہے۔ اسی بنیاد پر دنیا میں بھی کسی مجرم کے لئے سزا ہے اور اسی بنیاد پر آخرت میں بھی لوگوں کے لئے ان کے جرم کے مطابق سزا کا فیصلہ ہوگا۔

اور ہم نے جس بستی میں بھی کوئی نبی بھیجا، اس کے باشندوں کو ہم نے سختی اور تکلیف میں مبتلا کیا تاکہ وہ گڑگڑائیں۔ پھر ہم نے دکھ کو سکھ سے بدل دیا یہاں تک کہ انھیں خوب ترقی ہوئی اور وہ کہنے لگے کہ تکلیف اور خوشی تو ہمارے باپ دادوں کو بھی پہنچتی رہی ہے۔ پھر ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا اور وہ اس کا گمان بھی نہ رکھتے تھے۔ اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور ڈرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی نعمتیں کھول دیتے۔ مگر انھوں نے جھٹلایا تو ہم نے ان کو پکڑ لیا ان کے اعمال کے بدلے۔ پھر کیا بستی والے اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب رات کے وقت آپڑے جب کہ وہ سوتے ہوں۔ یا کیا بستی والے اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ہمارا عذاب آپہنچے ان پر دن چڑھے جب وہ کھیلتے ہوں۔ کیا یہ لوگ اللہ کی تدبیروں سے بے خوف ہو گئے ہیں۔ پس اللہ کی تدبیروں سے وہی لوگ بے خوف ہوتے ہیں جو تباہ ہونے والے ہوں ۹۹-۹۴

حدیث میں آیا ہے کہ مومن پر مصیبتیں آتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ اور منافق کی مثال گدھے کی طرح ہے کہ وہ نہیں جانتا کہ اس کے مالک نے کس لئے اس کو باندھا اور کیوں اس کو چھوڑ دیا (لا یزال البلاء بالمومن حتی یخرج نقیا من ذنوبہ والمنافق مثلہ کمثل الحمار لا یدری فیم ربطہ اھلہ ولا فیم ارسلوہ، تفسیر ابن کثیر)

خدا انسان کے اوپر مختلف قسم کی تکلیفیں ڈالتا ہے تاکہ اس کا دل نرم ہو۔ خدا کے سوا دوسری چیزوں پر اس کا اعتماد ٹوٹ جائے، اس کا وہ گھمنڈ جاتا رہے جو آدمی کے لئے اپنے سے باہر کسی سچائی کو قبول کرنے میں رکاوٹ بنتا ہے۔ اس طرح خدائی انتظام کے تحت آدمی کے اندر کمی اور بے چارگی کی نفسیات پیدا کی جاتی ہے تاکہ وہ حق کی آواز پر کان لگائے۔ خدا کا یہ معاملہ عام لوگوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور پیغمبر کے مخاطب گروہ کے ساتھ بھی۔ تاہم یہ معاملہ سنت الٰہی کے تحت التباس و اشتباہ کے پردہ میں ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی آفت آتی ہے تو وہ اسباب و علل کے روپ میں آتی ہے۔ یہ صورت حال بہت سے لوگوں کے لئے فتنہ بن جاتی ہے۔ وہ یہ کہہ کر اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ تو ایک ہونے والی بات تھی جو ہوئی۔ پھر جب وہ مصیبتوں سے اثر نہیں لیتے تو خدا ان کے حالات بدل کر ان کو خوش حالی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اب اس قسم کے لوگ اور بھی زیادہ مغالطہ میں پڑ جاتے ہیں۔ ان کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ محض حوادث روزگار کی بات تھی۔ یہ وہی عام اتار چڑھاؤ تھا جو ہمیشہ لوگوں کے ساتھ پیش آتا رہا ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ ہم کو برے دن کے بعد اچھے دن دیکھنے کو ملے۔ وہ پہلی تنبیہ سے بھی سبق لینے سے محروم رہتے ہیں اور دوسری تنبیہ سے بھی۔

سرکشی کے بعد کسی کو ترقی ملنا سخت خطرناک ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ خدا نے اس کو ایسی حالت میں پکڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے جب کہ وہ اپنے پکڑے جانے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ بے خوف ہو چکا ہو۔

ایمان اور تقویٰ کی زندگی کا فائدہ اگرچہ اصلاً آخرت میں ملنے والا ہے۔ تاہم خدا اگر چاہتا ہے تو دنیا میں بھی وہ ایسے لوگوں کو فراخی اور عزت کی صورت میں ان کے عمل کا ابتدائی انعام دے دیتا ہے۔

کیا سبق نہیں ملا ان کو جو زمین کے وارث ہوئے ہیں اس کے اگلے باشندوں کے بعد کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو پکڑ لیں ان کے گناہوں پر۔ اور ہم نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے پس وہ نہیں سمجھتے۔ یہ وہ بستیاں ہیں جن کے کچھ حالات ہم تم کو سنا رہے ہیں۔ ان کے پاس ہمارے رسول نشانیاں لے کر آئے تو ہرگز نہ ہوا کہ وہ ایمان لائیں اس بات پر جس کو وہ پہلے جھٹلا چکے تھے۔ اس طرح اللہ منکرین کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے۔ اور ہم نے ان کے اکثر لوگوں میں عہد کا نباہ نہ پایا اور ہم نے ان میں سے اکثر کو نافرمان پایا ۱۰۲ — ۱۰۰

زمین پر بار بار یہ واقعہ ہوتا ہے کہ ایک قوم کو یہاں عزت اور خوش حالی نصیب ہوتی ہے۔ اس کے بعد اس پر زوال آتا ہے۔ وہ میدان سے ہٹا دی جاتی ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم عزت اور خوش حالی کے تمام مقامات پر قابض ہو جاتی ہے۔

یہ واقعہ خدا کی ایک نشانی ہے۔ وہ آدمی کو خدا کی یاد دلانے والا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ ملنے یا نہ ملنے کے سرے کسی بالاتر ہستی کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ جس کو چاہے دے اور جس سے چاہے چھین لے۔ خدا نے انسان کو دیکھنے اور سمجھنے کی جو طاقت دی ہے اس کو کام میں لا کر وہ بآسانی اس حقیقت کو سمجھ سکتا ہے۔ وہ جان سکتا ہے کہ اصل سرچشمہ اگر کسی اور کے ہاتھ میں نہ ہوتا تو جو گروہ ایک بار غالب آجاتا وہ کبھی دوسرے کو اوپر آنے نہ دیتا۔ آدمی اگر اس قسم کا سبق لے تو قوموں کے عروج و زوال میں اس کو ربانی غذا ملے گی۔ مگر جب بھی ایک قوم پیچھے ہٹتی ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم اوپر آتی ہے تو اس کے افراد اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ پچھلی قوم کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ صرف پچھلی قوم کے لئے تھا، ہمارے ساتھ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔

خدا نے آنکھ اور کان اور عقل کی صلاحیت انسان کو اس لئے دی ہے کہ وہ اس سے سبق لے، وہ ان کے ذریعہ خدا کے اشارات کو سمجھے۔ مگر جب آدمی اپنی ان صلاحیتوں سے وہ کام نہیں لیتا جو اس کو لینا چاہئے تو اس کے بعد لازمی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ خدا کے قانون کے تحت اس کے دل کی حساسیت مردہ ہونے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ ان معاملات میں اس کے جذبات کند ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے دل و دماغ پر بے حسی کی مہر لگ جاتی ہے۔ اب اس کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ وہ دیکھنے کے باوجود نہ دیکھے اور سننے کے باوجود نہ سنے۔ وہ عقل رکھتے ہوئے بھی باتوں کو نہ سمجھے۔ وہ انسان ہوتے ہوئے بے انسان بن جائے۔

انسانیت کا آغاز حضرت آدم کے مومنین سے ہوا۔ اس کے بعد جب بگاڑ ہوا تو یاد دہانی کے لئے خدا کے پیغمبر آئے۔ اب یہ ہوا کہ پیغمبر کے ذریعہ اصلاح قبول کرنے والے افراد کو بچا کر ان لوگوں کو ہلاک کر دیا گیا جنھوں نے اصلاح قبول کرنے سے انکار کیا تھا۔ مگر بعد کی نسلیں دوبارہ اپنے پیغمبر کے ہاتھ پر کئے ہوئے عہد اسلام کو بھلا بیٹھیں اور دوبارہ وہی انجام پیش آیا جو پہلی بار مومنین آدم کے ساتھ پیش آیا تھا۔ یہ صورت بار بار پیش آتی رہی حتیٰ کہ نسل انسانی کی اکثریت کے لئے تاریخ نافرمانی اور عہد شکنی کی تاریخ بن گئی۔

پھران کے بعد ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا فرعون اور اس کی قوم کے سرداروں کے پاس۔ مگر انھوں نے ہماری نشانیوں کے ساتھ ظلم کیا۔ پس دیکھو کہ مفسدوں کا کیا انجام ہوا۔ اور موسیٰ نے کہا اے فرعون، میں پروردگار عالم کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں۔ سزاوار ہوں کہ اللہ کے نام پر کوئی بات حق کے سوا نہ کہوں۔ میں تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے کھلی ہوئی نشانی لے کر آیا ہوں۔ پس تو میرے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دے۔ فرعون نے کہا، اگر تم کوئی نشانی لے کر آئے ہو تو اس کو پیش کرو اگر تم سچے ہو۔ تب موسیٰ نے اپنا عصا ڈال دیا تو یکایک وہ ایک صاف اژدہا بن گیا۔ اور اس نے اپنا ہاتھ نکالا تو اچانک وہ دیکھنے والوں کے سامنے چمک رہا تھا۔ فرعون کی قوم کے سرداروں نے کہا یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے۔ چاہتا ہے کہ تم کو تمھاری زمین سے نکال دے۔ اب تمھاری کیا صلاح ہے۔ انھوں نے کہا، موسیٰ کو اور اس کے بھائی کو مہلت دو اور شہروں میں ہرکارے بھیجو کہ وہ تمھارے پاس سارے ماہر جادوگر لے آئیں ۱۱۲ - ۱۰۳

پیغمبر کا خطاب اولاً ان لوگوں سے ہوتا ہے جو وقت کے سردار ہوں، جن کو ماحول میں فکری قیادت حاصل ہو۔ یہ لوگ اپنی برتر ذہنی صلاحیت کی وجہ سے سب سے زیادہ اس پوزیشن میں ہوتے ہیں کہ سچائی کے پیغام کو اس کی گہرائی کے ساتھ سمجھ سکیں۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ ان لوگوں نے پیغمبرانہ دعوت کے ساتھ ہمیشہ "ظلم" کا سلوک کیا۔ یعنی اپنی ذہانت کو اس کے لئے استعمال کیا کہ حق کے پیغام کو ٹیڑھے معنی پہنائیں۔ مثلاً ایک نشانی جو یہ ثابت کر رہی ہو کہ وہ خدا کے زور پر ظاہر ہوئی ہے اس کے متعلق یہ کہہ دینا کہ یہ جادو کے زور پر دکھائی گئی ہے۔ یا تحریک کو بدنام کرنے کے لئے اس کو سیاسی معنی پہنانا اور یہ کہنا کہ یہ لوگ محض اپنے اقتدار کے لئے اٹھے ہیں۔ عوام چونکہ باتوں کا تجزیہ نہیں کر پاتے اس لئے اس قسم کی باتیں ان کو حق سے مشتبہ کرنے کا سبب بن جاتی ہیں۔ مگر داعیٔ حق کے خلاف ایسے شوشے نکالنا بہت بڑا جرم ہے۔ اس طرح وقت کے بڑے اپنی قیادت کا تحفظ تو ضرور کر لیتے ہیں مگر یہ تحفظ ان کو صرف اس قیمت پر ملتا ہے کہ ان کی آخرت ہمیشہ کے لئے غیر محفوظ ہو جائے۔

خدا کامل حق پر ہے۔ اس لئے جو شخص خدا کی طرف سے اٹھے اس کے لئے جائز نہیں کہ وہ حق و انصاف کے سوا کوئی دوسرا کلمہ اپنی زبان سے نکالے۔ اگر وہ حق کے سوا کوئی بات بولے تو وہ خدا کی نمائندگی کے استحقاق کو کھو دے گا اور خدا کے یہاں انعام کے بجائے سزا کا مستحق ہو جائے گا۔

حضرت موسیٰ بیک وقت بنی اسرائیل کی طرف بھی مبعوث تھے اور فرعون اور اس کی قبطی قوم کی طرف بھی۔ بنی اسرائیل میں اگرچہ اس وقت بہت سی کمزوریاں آچکی تھیں۔ تاہم بنیادی طور پر انھوں نے حضرت موسیٰ کا ساتھ دیا۔ اس کے برعکس فرعون اور اس کی قوم نے (چند افراد کو چھوڑ کر) آپ کا انکار کیا۔ بالآخر چالیس سال تبلیغ کے بعد آپ نے بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ آپ نے فرعون سے مطالبہ کیا کہ بنی اسرائیل کو ملک سے باہر جانے دے تاکہ وہ بیابان کی کھلی فضا میں جا کر ایک خدا کی عبادت کر سکیں (خروج ۱۰) حضرت موسیٰ اگرچہ سچائی کے نمائندہ تھے۔ مگر فرعون نے اس کو جادو کا معاملہ سمجھا اور جادوگروں کے ذریعہ آپ کو زیر کرنے کا فیصلہ کیا۔

اور جادوگر فرعون کے پاس آئے۔ انھوں نے کہا، ہم کو انعام تو ضرور ملے گا اگر ہم غالب رہے۔ فرعون نے کہا، ہاں اور یقیناً تم ہمارے مقربین میں داخل ہو گے۔ جادوگروں نے کہا، یا تو تم ڈالو یا ہم ڈالنے والے بنتے ہیں۔ موسیٰ نے کہا۔ تم ہی ڈالو۔ پھر جب انھوں نے ڈالا تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور ان پر دہشت طاری کر دی اور بہت بڑا کرتب دکھایا، اور ہم نے موسیٰ کو حکم بھیجا کہ اپنا عصا ڈال دو۔ تو اچانک وہ نگلنے لگا اس کو جو انھوں نے گھڑا تھا۔ پس حق ظاہر ہو گیا اور جو کچھ انھوں نے بنایا تھا باطل ہو کر رہ گیا۔ پس وہ لوگ وہیں ہار گئے اور ذلیل ہو کر رہے۔ اور جادوگر سجدہ میں گر پڑے۔ انھوں نے کہا، ہم ایمان لائے رب العالمین پر جو رب ہے موسیٰ اور ہارون کا　　۱۲۲ — ۱۱۳

کسی ماحول میں جس چیز کی اہمیت لوگوں کے ذہنوں پر چھائی ہوئی ہو اسی نسبت سے ان کے پیغمبر کو معجزہ دیا جاتا ہے۔ قدیم مصر میں جادو کا بہت زور تھا اس لئے حضرت موسیٰ کو اسی نوعیت کا معجزہ دیا گیا۔

فرعون کے طے کردہ پروگرام کے مطابق مصریوں کے قومی تیوہار (یوم الزینہ) کے موقع پر ان کے تمام بڑے بڑے جادوگر جمع ہوئے۔ جادوگروں نے کہا کہ پہلے ہم اپنا کرتب سامنے لائیں یا تم جو کچھ دکھانا چاہتے ہو دکھاؤ گے۔ حضرت موسیٰ نے کہا پہلے تم اپنا کرتب سامنے لاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اپنے دشمن کے خلاف اقدام کرنے میں کبھی پہل نہیں کرتا۔ وہ آخر وقت تک دشمن کو موقع دیتا ہے کہ وہ خود پہل کرے۔ فریق مخالف جب اس طرح پہل کی ذمہ داری اپنے اوپر لے چکا ہوتا ہے اس وقت پیغمبر اپنی پوری قوت کو استعمال کر کے اسے زیر کر دیتا ہے۔ نظریاتی دعوت کے معاملہ میں پیغمبر کا طریقہ اقدام کا ہوتا ہے اور عملی ٹکراؤ کے معاملہ میں دفاع کا۔

مصر میں حضرت موسیٰ کی دعوت تقریباً چالیس سال تک جاری رہی ہے۔ جادوگروں سے مقابلہ کا واقعہ اس کے آخری زمانہ کا ہے۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جادوگر حضرت موسیٰ کی دعوت سے آشنا رہے ہوں گے۔ تاہم ابھی تک ان کی آنکھ کا پردہ نہیں ہٹا تھا۔ جب انھوں نے اپنے مخصوص فن کے میدان میں حضرت موسیٰ کی برتری دیکھی تو حجابات اٹھ گئے۔ ان کو نظر آ گیا کہ یہ جادوگری کا معاملہ نہیں بلکہ خدائی پیغمبری کا معاملہ ہے۔ وہ بے اختیار ہو کر خدا کے سامنے گر پڑے۔

جادوگروں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں پھینکیں تو خیال بندی کی وجہ سے وہ لوگوں کو چلتا پھرتا سانپ نظر آنے لگیں۔ مگر جب حضرت موسیٰ کا عصا سانپ بن کر میدان میں گھوما تو جادوگروں کی ہر لاٹھی اور رسی صرف لاٹھی اور رسی ہو کر رہ گئی۔ جادوگر جادو کے حدود کو جانتے تھے — اس واقعہ میں جادوگروں کو نظر آ گیا کہ انسانی تدبیریں اپنے آخری کمال پر پہنچ کر بھی کتنی حقیر ہیں اور خدا کتنا عظیم اور کتنا زیادہ طاقت ور ہے۔ اس کے بعد فرعون ان کو اپنے تمام اقتدار کے باوجود بے وقعت نظر آنے لگا۔ وہی جادوگر جو خدا کی عظمت کو دیکھنے سے پہلے فرعون سے انعام کے طالب تھے۔ اب انھوں نے فرعون کی طرف سے بدترین سزاؤں کی دھمکی کو بھی اس طرح نظر انداز کر دیا جیسے اس کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔

فرعون نے کہا، تم لوگ موسیٰ پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمھیں اجازت دوں۔ یقیناً یہ ایک سازش ہے جو تم لوگوں نے شہر میں اس غرض سے کی ہے کہ تم اس کے باشندوں کو یہاں سے نکال دو، تو تم بہت جلد جان لو گے۔ میں تمھارے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹوں گا پھر تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا۔ انھوں نے کہا، ہم کو اپنے رب ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ تو ہم کو صرف اس بات کی سزا دینا چاہتا ہے کہ ہمارے رب کی نشانیاں جب ہمارے سامنے آگئیں تو ہم ان پر ایمان لے آئے۔ اے رب، ہم پر صبر انڈیل دے اور ہم کو وفات دے اسلام پر۔ ۱۲۶-۱۲۳

حق کے لئے جان قربان کرنا حق کے حق ہونے کی آخری گواہی دینا ہے۔ جادوگروں کو خدا کی مدد سے اسی کی توفیق حاصل ہوئی۔ جادوگروں نے اپنے آپ کو سخت ترین سزا کے لئے پیش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ان کا حضرت موسیٰ پر ایمان لانا کوئی حیلہ اور سازش کا معاملہ نہیں، یہ سچے اعتراف حق کا معاملہ ہے۔ مگر جادوگروں کا سب سے بڑا عمل فرعون کی متکبرانہ نفسیات کے لئے سب سے بڑا تازیانہ تھا۔ انھوں نے فرعون کے مقابلہ میں موسیٰ کا ساتھ دے کر فرعون کو ساری قوم کے سامنے رسوا کر دیا تھا۔ چنانچہ فرعون ان کے خلاف غصہ سے بھر گیا۔ اس نے جادوگروں کے ساتھ اسی ظالمانہ کارروائی کا فیصلہ کیا جو ہر وہ متکبر شخص کرتا ہے جس کو زمین پر کسی قسم کا اختیار حاصل ہو جائے۔ جادوگر بھی دلیل کے میدان میں ہارے اور فرعون بھی۔ مگر جادوگر اپنی شکست کا اعتراف کر کے خدا کی ابدی نعمتوں کے مستحق بن گئے اور فرعون نے اس کو اپنی عزت کا مسئلہ بنا لیا۔ اس کے حصہ میں صرف یہ آیا کہ اپنی جھوٹی انانیت کی تسکین کے لئے دنیا میں وہ حق پرستوں پر ظلم کرے اور آخرت میں خدا کے ابدی عذاب میں ڈال دیا جائے۔

فرعون نے موسیٰ کی دعوت قبول کرنے یا نہ کرنے کو اپنی "اجازت" کا مسئلہ سمجھا۔ اور جادوگروں نے "نشانی" کا۔ متکبر آدمی کا مزاج ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی مرضی کو سب سے زیادہ اہم سمجھتا ہے نہ کہ دلیل اور ثبوت کو۔ ایسے لوگ کبھی حق کو قبول کرنے کی توفیق نہیں پاتے

اس نازک ترین موقع پر جادوگروں نے جو کامل استقامت دکھائی وہ سراسر خدا کی مدد سے تھی اور ان کی زبان سے جو دعائیں نکلی وہ بھی تمام تر الہامی دعائیں تھی۔ جب کوئی بندہ اپنے آپ کو ہمہ تن خدا کے حوالے کر دیتا ہے تو اس وقت وہ خدا کے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ اس کو خدا کا خصوصی فیضان پہنچنے لگتا ہے۔ اس وقت اس کی زبان سے ایسے کلمات نکلتے ہیں جو خدا کے القا کئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس وقت وہ وہی دعا کرتا ہے جس کے متعلق اس کا خدا پہلے ہی فیصلہ کر چکا ہوتا ہے کہ وہ اس کے لئے قبول کر لی گئی ہے۔

جادوگروں کا یہ کہنا کہ خدایا ہمارے اوپر صبر انڈیل دے اور ہماری موت آئے تو اسلام پر آئے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ ہم نے اپنے بس بھر اپنے آپ کو تیرے حوالے کر دیا ہے۔ اب جو کچھ ہمارے بس سے باہر ہے اس کے واسطے تو ہمارے لئے کافی ہو جا۔ جب بھی کوئی بندہ دین کی راہ میں دل سے یہ دعا کرتا ہے تو خدا یقیناً اس کی مشکلات میں اس کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔

تبلیغ کی طاقت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: تم منکروں کی بات نہ مانو اور ان کے ساتھ جہاد کرو، بڑا جہاد (فلا تطع الکافرین وجاھدھم بہ جھادا کبیرا، فرقان ۵۲) سورہ فرقان بالاتفاق مکی سورہ ہے۔ مکی دور میں قتال کا حکم نہیں اترا تھا بلکہ صراحتہً اس سے روکا گیا تھا (کفوا ایدیکم واقیموا الصلاۃ، نساء ۷۷) اس لئے یہاں جہاد کو لازماً غیر حربی مفہوم میں لینا ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے بہ کی ضمیر کا مرجع قرآن لیا ہے اور جاھدھم بہ کی تفسیر جاھدھم بالقرآن سے کی ہے (تفسیر ابن کثیر) اس تفسیر کے مطابق آیت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی دعوت پیش کرنے میں پوری کوشش کرو۔ قرآن کی نظریاتی اشاعت کے ذریعہ باطل کا مقابلہ کرو۔

جہاد کا لفظ قرآن کے دوسرے مقامات پر جنگ وقتال کے لئے بھی آیا ہے۔ مگر ایسے مقامات پر صرف جہاد کا لفظ ہے۔ مگر سورہ فرقان میں جس عمل کا ذکر ہے اس کو "جہاد کبیر" سے تعبیر کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا کی نظر میں سب سے بڑا جہاد وہ نہیں ہے جو میدان جنگ میں ہتھیاروں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ سب سے بڑا جہاد وہ ہے جو قرآنی پیغام کی تبلیغ واشاعت کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے۔

اسلام کا اصل مقصد لوگوں سے لڑنا نہیں بلکہ لوگوں کو خدا کی رحمت کے سایہ میں لانا ہے۔ لڑائی اسلام کا ایک اتفاقی عمل ہے جب کہ دعوت اسلام کا اصلی اور دائمی عمل۔ مومن دوسروں کے حق میں حد درجہ خیر خواہ ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ خدا کے بندوں کو جہنم کے خطرے سے بچائے اور ان کو جنت کے راستہ پر لگائے۔ یہ کام سنجیدہ تبلیغ اور حکیمانہ نصیحت کے ذریعہ ہوتا ہے نہ کہ لڑائی بھڑائی کے ذریعہ۔ نیز خارجی دنیا میں فتح کی اصل جڑ بھی دلوں کی فتح ہے۔ لوگوں کے دلوں پر قبضہ حاصل ہو جائے تو گویا ان کی ساری چیز قبضہ میں آگئی۔ تلوار کے ذریعہ حاصل کی ہوئی فتح عارضی اور جزئی ہوتی ہے اور دل کی راہ سے حاصل کی ہوئی فتح مستقل اور مکمل ہوتی ہے۔ اگر آپ نے جنگ کا میدان جیتا تو آپ نے صرف ایک "میدان" جیتا۔ لیکن اگر آپ نے دلوں کو جیت لیا تو آپ نے پوری قوم اور اس کے سارے اثاثہ کو جیت لیا۔

جو چیز حکمت سے حاصل ہو سکتی ہے اس کو جبر سے حاصل کرنے کی کوشش کرنا صرف یہ خطرہ مول لینا ہے کہ وہ کبھی حاصل نہ ہو۔ حضرت عمر کی خلافت کے زمانہ میں حساب کتاب کا نظام قائم ہوا تو دفاتر کے لئے وہی اجنبی زبانیں اختیار کر لی گئیں جو پہلے سے مفتوحہ ممالک میں رائج تھیں۔ مثلاً ایران کے لئے فارسی، شام کے لئے سریانی، مصر کے لئے قبطی۔ اگر اول دن سے عربی زبان پر اصرار کیا جاتا تو غیر ضروری قسم کے لڑائی جھگڑے شروع ہو جاتے جو کبھی ختم نہ ہوتے۔ مگر مقامی زبانیں اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام اور عربیت کی اشاعت

کا پرامن عمل اپنی فطری رفتار سے جاری رہا۔ یہاں تک کہ بالآخر یہ تمام علاقے عرب علاقے بن گئے اور سب کی زبان عربی زبان ہوگئی۔

اسلام کی اصل طاقت تلوار نہیں، اسلام کی اصل طاقت تبلیغ ہے۔ اس سلسلے میں یہاں ماسٹر تاراسنگھ (۱۹۶۷ — ۱۸۸۵) کا ایک بیان نقل کیا جاتا ہے:

جب کوئی مجھ سے یہ کہتا ہے کہ حضرت محمد صاحب نے تلوار کے زور سے اپنا مذہب پھیلایا تھا تو مجھے اس شخص کی ناسمجھی پر ہنسی آتی ہے۔ اس اعتراض کرنے والے کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس اعتراض سے تو وہ محمد صاحب کو غیبی طاقت کا مالک تسلیم کر رہا ہے۔ اگر ایک تنہا محمدؐ دنیا کے مقابلہ میں تلوار سے کامیاب ہوتا ہے تو یقیناً یہ ایک معجزہ ہے۔ اپنی سچائی اور ایمان داری کی مدد سے کامیابی حاصل کرنا اتنا بڑا معجزہ نہیں جتنا کہ تلوار کے زور سے مذہب پھیلانے میں کامیابی حاصل کرنا۔

فرض کیا جائے کہ محمد نے پہلا، پھر دوسرا، پھر تیسرا، پھر چوتھا مسلمان تلوار کے زور سے ہی بنایا تھا تو یہ اشخاص جبراً مسلمان کئے جانے کی وجہ سے محمدؐ کے دشمن ہو گئے ہوں گے۔ ایک ایک کو تو تلوار کے زور سے محمد صاحب مسلمان کر سکتے تھے۔ لیکن جب وہ تین چار اکٹھے ہوئے تھے تو انھوں نے کیوں محمد صاحب سے بدلہ نہ لیا۔ اگر اس بات کا جواب یہ دیا جائے کہ وہ مسلمان تو تلوار کے زور سے ہی ہوئے تھے لیکن بعد میں وہ محمد صاحب پر صدق دل سے ایمان لے آئے تھے، تو یہ ایک فضول سی بات ہے جسے کوئی ماننے کو تیار نہ ہوگا کہ جس پر جبر کیا جائے وہی بعد میں دوست بن جائے۔ ایسی بھدی دلیل کے یہ معنی ہیں کہ کوئی ایک شخص جو جسمانی طور پر دوسروں سے طاقت ور ہے ایک ایک کو فتح کرنے کے بعد اپنا مذہب پھیلا سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی مہمل دلیل ہے کہ اس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں۔

مسلمانوں نے بعض موقعوں پر مذہب کی مدد کے لئے تلوار کا استعمال ضرور کیا تھا۔ لیکن اس بات کی ذمہ داری حضرت محمد صاحب پر نہیں آسکتی۔ جو شخص مذہب کے نام پر تلوار کی جنگ میں شریک ہوتا ہے اور اس طرح اپنے آپ کو خطرہ میں ڈالتا ہے اس کا ایمان بھی کافی حد تک مضبوط ہوتا ہے۔ یقین کی پختگی کے بغیر کوئی شخص اپنے آپ کو جنگ کے خطرہ میں نہیں ڈالے گا۔ اس لئے تلوار چلانے کے لئے بھی تو پہلے یقین کرنے والے مضبوط دلوں کی ضرورت ہے جو صرف وعظ سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ تلوار بھی وعظ سے پیدا ہوئے یقین کے بغیر نہیں اٹھائی جا سکتی (رسول نمبر رسالہ مولوی دہلی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مصر ایک غیر مسلم ملک تھا۔ وہاں عیسائی اور مشرک قومیں بستی تھیں۔ وہاں کی زبان قبطی تھی۔ اس کے بعد مصر کو مسلمانوں نے فتح کیا۔ مصر نہ صرف سیاسی اعتبار سے فتح ہوا بلکہ سارا مصر

مسلمان ہوگیا۔ وہاں کی زبان بدل کر عربی زبان ہوگئی۔ ایسا کیوں کر ہوا۔ عام آدمی جس نے تاریخ کا گہرا مطالعہ نہ کیا ہو وہ کہہ دے گا کہ یہ تلوار کے ذریعہ ہوا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ مصر کو اور مصریوں کو جس نے فتح کیا وہ عربی تلوار نہیں تھی بلکہ عربی قرآن تھا۔ یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس کو غیر مسلم محققین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ سر آرتھر کیتھ ایک مشہور انگریز مورخ ہے۔ اس نے مصر کی قدیم تاریخ کا نہایت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس نے مصر میں اسلام کی کامیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مصریوں کو جس چیز نے فتح کیا وہ تلوار نہیں تھی بلکہ قرآن تھا :

The Egyptians were conquered not by the sword, but by the Koran (303)

پروفیسر آرنلڈ کی کتاب دی پریچنگ آف اسلام (۱۸۹۶) خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ انھوں نے اسلام کی دعوتی تاریخ پیش کرتے ہوئے دکھایا ہے کہ کس طرح اسلام اپنے نظریات کے زور سے پھیلتا رہا۔ یہاں اس کتاب کے چند اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں :

"پیغمبر محمد کے پیرو پیغمبر کی موت کے صرف ایک سو سال میں رومن ایمپائر سے بھی زیادہ بڑی سلطنت کے مالک بن چکے تھے۔ بعد کی صدیوں میں اگرچہ عظیم مسلم سلطنت کے ٹکڑے ہوگئے اور اسلام کی سیاسی طاقت کم زور پڑ گئی۔ تاہم اس کی روحانی فتوحات بغیر کسی وقفہ کے جاری رہیں :

Still its spiritual conquests went on uninterruptedly (2)

جب منگول قبائل نے ۱۲۵۸ء میں بغداد کو تباہ کیا اور عباسی خلافت کی عظمت کو خون کے دریا میں بہا دیا، جب ۱۲۳۶ء میں فرڈیننڈ نے مسلمانوں کو قرطبہ و غرناطہ سے نکال دیا جو اسپین میں اسلام کا آخری مرکز تھا تو عین اسی وقت اسلام نے سماٹرا اور ملایا میں اپنے لئے زمین حاصل کر لی۔ اپنے سیاسی تنزل کے زمانہ میں اسلام نے اپنی بعض انتہائی نمایاں روحانی فتوحات حاصل کی ہیں :

In the hours of its political degradation, Islam has achieved some of its most brilliant spiritual conquests

سلجوقی ترکوں نے گیارھویں صدی عیسوی میں اور منگولوں نے تیرھویں صدی عیسوی میں قومی پیمانہ پر اسلام قبول کر لیا۔ یہ دونوں کے دونوں اسلام کے فاتح تھے مگر فاتحین نے اپنے مفتوحوں کے دین کو قبول کر لیا :

in each case the conquerors have accepted the religion of the conquered

بغیر کسی دنیوی اور مادی طاقت کے مسلمان مبلغین اپنے دین کو وسط افریقہ، چین اور ایسٹ انڈیز جزائر تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے :

Unaided by the temporal power, Muslim missionaries have carried their faith into Central Africa, China and the East Indies Islads (2)

خدا کی خاطر بے اختیار ہونے والے

اس دنیا میں سارا اختیار صرف خدا کا ہے، اس کے سوا کسی کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔ مگر امتحان کی غرض سے خدا نے انسان کو آزادی دے دی ہے۔ ایک مکمل طور پر بے اختیار دنیا میں انسان کو مکمل طور پر اختیار دیا گیا ہے اور اب خدا یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ اختیار کو پا کر کیا کرتا ہے۔ وہ حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کر کے اللہ کے آگے جھک جاتا ہے یا ظاہری اختیار کی وجہ سے دھوکے میں پڑ کر سرکشی کرتا ہے۔

جنت ان لوگوں کے لئے ہے جو اختیار رکھتے ہوئے اللہ کی خاطر اپنے کو بے اختیار کر لیں۔ جو بے خوفی کا موقع ہوتے ہوئے اللہ سے ڈریں۔ بظاہر خود سب کچھ ہوتے ہوئے اللہ کو اپنا سب کچھ بنا لیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کو اسباب کے پردہ میں رزق دیا گیا مگر اس کو انھوں نے براہ راست اللہ کی طرف سے آیا ہوا رزق سمجھا۔ ان کو اللہ نے ظلم کی قدرت دی مگر انھوں نے اللہ کے خوف سے اپنے ہاتھوں کو ظلم کرنے سے روک لیا۔ اللہ نے ان کو غصہ، نفرت، انتقام کے مواقع دئے مگر اللہ کی خاطر انھوں نے غصہ کے موقع پر صبر کیا اور نفرت اور انتقام کے موقع پر درگزر کرنے کا طریقہ اپنایا۔ اللہ نے ان کی تعریف میں لوگوں کی زبانیں کھلوائیں مگر ان کو عجز و تواضع میں لذت ملی۔ اللہ نے ان کو دولت دی مگر دولت کو اپنے ذاتی عیش میں خرچ کرنے کے بجائے انھیں اس میں تسکین ملی کہ وہ اپنی دولت کو اللہ کی راہ میں لٹائیں۔ وہ اپنی مرضی پر چلنے کے بجائے اللہ کی مرضی پر چلے۔ وہ اپنے لئے جینے کے بجائے صرف اللہ کے لئے جئے۔

جنت کی نفیس دنیا ان لوگوں کے لئے ہے جنھوں نے اپنے آزاد ارادہ سے اپنے کو خدا کا محکوم بنایا۔ جنھوں نے پابند نہ ہو کر بھی خدائی پابندی کے رویہ کو اپنے لئے پسند کر لیا۔ جو پوری طرح آزاد ہونے کے باوجود پوری طرح خدا کے تابعدار بن گئے۔

آدمی کا امتحان

زندگی کا سارا معاملہ امتحان کا معاملہ ہے۔ کوئی شخص بظاہر اچھے حالات میں ہے اور کوئی بظاہر برے حالات میں۔ مگر اس اعتبار سے دونوں یکساں ہیں کہ دونوں امتحان کے ترازو میں کھڑے ہوئے ہیں۔ یہاں ہر آدمی کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ کسی کا امتحان ایک قسم کے حالات میں ہے اور کسی کا دوسرے قسم کے حالات میں۔

اللہ ہر آدمی کو مختلف قسم کے حالات میں ڈال کر یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون اپنے حالات میں کس قسم کا ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ اسی ردعمل پر آدمی کے آخرت کے انجام کا فیصلہ ہونا ہے۔ اللہ ایسے حالات پیدا کرتا ہے جس میں ایک شخص حق پر ہوتے ہوئے کمزور پڑ جائے اور دوسرا شخص ناحق پر ہوتے ہوئے مضبوط حیثیت حاصل کر لے، اب جس شخص نے دوسرے سے معاملہ کرنے میں حق کا لحاظ کیا وہ جنتی ٹھہرا اور جس شخص نے دوسرے سے معاملہ کرنے میں موقع پرستی کا طریقہ اختیار کیا وہ جہنم کا سزاوار ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ایسے مواقع پیدا کرتا ہے جس میں ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچے۔ اب جس شخص نے ایسے موقع پر تواضع کا طریقہ اختیار کیا وہ جنتی قرار پایا اور جس نے گھمنڈ کا مظاہرہ کیا وہ جہنمی بن گیا۔ اللہ تعالیٰ کسی کو کمزور بناتا ہے اور کسی کو طاقت ور۔ اب جس شخص نے انصاف کے پہلو کو اہمیت دیتے ہوئے اس کے مطابق لوگوں کے ساتھ معاملہ کیا وہ جنت کا مستحق ٹھہرا اور جو شخص طاقت ور کے آگے جھکے اور کمزور کو ذلیل کرے وہ جہنم کا مستحق ہو گیا۔

اسی طرح آدمی کی زندگی میں روزانہ جو معاملات پیش آتے ہیں وہ اس کے لئے خدا کی طرف سے امتحان کے پرچے ہیں۔ ہر روز آدمی اپنے رویہ سے یا تو اپنے کو جنت کی طرف لے جاتا ہے یا جہنم کی طرف۔ آدمی کی زندگی میں ہر روز دو راستے کھلتے ہیں۔ آدمی ایک رخ پر جا کر اپنے کو جنت میں داخل کر دیتا ہے اور دوسرے رخ پر جا کر اپنے کو جہنم میں گرا لیتا ہے۔

جانچا جارہا ہے

موجودہ دنیا میں ارادہ کی حد تک انسان کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ مگر واقعات برپا کرنے کا اختیار کسی کو نہیں۔ دنیا میں جتنے واقعات ہوتے ہیں سب خدا کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اور ان کی مصلحت یہ ہوتی ہے کہ مختلف حالات میں ڈال کر افراد کا امتحان لیا جائے۔

کوئی واقعہ اس لئے ہوتا ہے کہ ایک شخص کو صبر، انصاف اور حق پرستی کا کریڈٹ دیا جائے اور دوسرے شخص کو بے صبری، ظلم اور حق سے بے پروائی کا مجرم ٹھہرایا جائے۔ کوئی واقعہ اس لئے پیش آتا ہے کہ ایک شخص کو کسی بندۂ خدا کے خلاف سازش، بدمعاملگی اور زیادتی کا موقع دے کر اس کے جھوٹے دعویٰ اسلام کو باطل ثابت کیا جائے۔ دوسری طرف اس بندۂ خدا کی خصوصی تائید کر کے لوگوں کو بتایا جائے کہ وہ سچائی پر ہے اور اس کی مدد پر خدا کھڑا ہوا ہے۔ ایک شخص حق پر ہوتا ہے، اس کے باوجود اس کو بے بسی اور بے کسی کی حالت میں ڈال دیا جاتا ہے۔ دوسرا شخص ناحق پر ہوتا ہے اس کے باوجود اس کے گرد دنیا کی رونقیں جمع کر دی جاتی ہیں۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کون ہے جو ظاہر سے گزر کر حق کو پالیتا ہے اور حق کا ساتھ دینے والا قرار پاتا ہے اور کون ہے جو ظاہری چیزوں میں اٹک جاتا ہے اور اس کا مستحق ٹھہرتا ہے کہ خدا کے یہاں اس کو حق کو نظر انداز کرنے والوں میں اٹھایا جائے۔

موجودہ دنیا میں ہر چیز امتحان کے لئے ہے۔ یہاں طاقت ور ہونا بھی امتحان کے لئے ہے اور کمزور ہونا بھی امتحان کے لئے۔ یہاں کسی کو امیر بنا کر جانچا جارہا ہے اور کسی کو غریب بنا کر۔ موجودہ دنیا میں نہ کسی کامیاب شخص کے لئے خوش ہونے کا موقع ہے اور نہ کسی ناکام شخص کے لئے غم گین ہونے کا۔ کیوں کہ دونوں یکساں طور پر امتحان کے میدان میں کھڑے ہوئے ہیں۔ خدا مختلف قسم کے واقعات برپا کر کے یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون اپنے حالات میں کس قسم کے ردعمل کا اظہار کرتا ہے۔ اسی ردعمل پر کسی کے لئے جنت کا فیصلہ ہوتا ہے اور کسی کے لئے جہنم کا۔

کوئی دنیا کما رہا ہے کوئی آخرت

ایک آدمی وہ ہے جس کا مقصود پیسہ ہے۔ اس نے کوئی ایسا کام پکڑ لیا ہے جس سے پیسہ ملتا ہے اور اپنے پورے وقت اور اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اس میں مصروف ہے۔ جب اس کی سرگرمیوں کا نتیجہ پیسہ کی صورت میں اس کی طرف لوٹتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے اور جب پیسہ نہ ملے تو وہ تردد میں پڑ جاتا ہے۔ دوسرا آدمی وہ ہے جو عزت و شہرت کا طالب ہے۔ وہ ہر اس کام کی طرف دوڑ پڑتا ہے جس میں اس کا نام اونچا ہو اور جس میں شرکت کی وجہ سے ہر طرف اس کا چرچا ہونے لگے۔ اعزاز اور مقبولیت کے مقام پر کھڑا ہو کر اس کے نفس کو لذت ملتی ہے اور اگر اس کو اعزاز اور مقبولیت کے مقام پر کھڑا ہونے کا موقع نہ ملے تو اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کی دنیا کھو گئی ہے۔ تیسرا آدمی وہ ہے جو اقتدار کو اپنا نشانہ بنائے ہوئے ہے۔ اس کی بہترین تمنا یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کے اوپر اس کا حکم چلے۔ لوگوں کی گردنیں اس کی مٹھی میں ہوں۔ لوگوں کے درمیان اس کو سب سے اوپر جگہ ملے۔ اس کے مقابلہ میں لوگ بے اختیار ہوں اور اس کو لوگوں کی قسمتوں پر اختیار حاصل ہو ——— یہ تینوں آدمی وہ ہیں جنھوں نے اپنے عمل کا نتیجہ اسی دنیا میں چاہا۔ ایسے لوگ دنیا میں خواہ جتنا بھی حاصل کر لیں، آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔

اس کے بعد وہ اللہ کا بندہ ہے جو آخرت کو چاہنے والا ہے اور آخرت کی راہ میں اپنی سرگرمیوں کو لگائے ہوئے ہے۔ لوگوں کا عمل بازار میں ہوتا ہے اور اس کا عمل فطرت کی خاموش کائنات میں۔ لوگ مجمع عام میں اپنی سرگرمیاں دکھاتے ہیں اور وہ اپنی تنہائیوں میں مصروف عمل ہوتا ہے۔ لوگ دنیا کی عزت و کامیابی پا کر خوش ہوتے ہیں اور وہ اس امید میں جی رہا ہوتا ہے کہ اس کا مالک اس کو اپنی رحمتوں کے سائے میں لے لے۔ بظاہر وہ اسی دنیا میں دکھائی دیتا ہے مگر اپنی سوچ اور جذبات کے اعتبار سے وہ آخرت میں جیتا ہے۔ لوگ سامنے کی دنیا میں گم ہوتے ہیں اور وہ خدا کی چھپی ہوئی کائنات میں۔

حقیقت نہ کہ صورت

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے (الاعمال بالنیات) اس سے معلوم ہوا کہ دین میں جو اعمال بتائے گئے ہیں وہ محض اپنی شکل کے اعتبار سے مطلوب نہیں ہیں بلکہ حقیقت کے اعتبار سے مطلوب ہیں۔ یعنی ہر عمل کی ایک روح ہے۔ کسی عمل میں اگر وہ روح پائی جائے جس کے لئے وہ عمل مقرر کیا گیا ہے تو اس عمل کی قیمت ہے اور اگر وہ روح نہ پائی جائے تو پھر اس عمل کی کوئی قیمت اللہ کے یہاں نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اکثر وہ اعمال جن پر بڑے بڑے ثواب بتائے گئے ہیں انھیں کے بارے میں بالکل دوسرے قسم کے اقوال بھی وارد ہیں۔ مثلاً قرآن خدا کی کتاب ہے اور اس کو پڑھنا بہت ثواب ہے۔ مگر اسی کے ساتھ حدیث میں آیا ہے کہ بہت سے قرآن پڑھنے والے ایسے ہیں کہ قرآن ان پر لعنت کرتا ہے (رُبَّ تالٍ للقرآن والقرآن یلعنہ) نماز اہم ترین عبادت ہے مگر حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ وہ نماز نماز نہیں جس میں خشوع نہ ہو (لا صلاۃ لمن لم یتخشع) روزہ کا اجر اللہ کے یہاں بہت ہے مگر اسی کے ساتھ حدیث بتاتی ہے کہ بہت سے روزہ دار ایسے ہیں کہ روزہ سے ان کو بھوک پیاس کے سوا اور کچھ نہیں ملتا (کم من صائم لیس لہ من صیامہ الا الجوع والعطش) اللہ کی راہ میں خرچ کرنا بہت ثواب کی چیز ہے مگر حدیث میں ہے کہ جس نے دکھانے کے لئے صدقہ کیا اس نے شرک کیا (من تصدق یرائی فقد اشرک) قربانی بہت اعلیٰ عبادت ہے مگر قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ کو تمھارا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے (لن ینال اللہ لحومہا ولا دماؤہا ولکن ینالہ التقوی منکم)

اسی طرح کے نصوص اکثر اعمال کے بارے میں وارد ہیں۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تمھارے جسموں اور تمھاری صورتوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمھارے دلوں کو دیکھتا ہے (ان اللہ تعالیٰ لا ینظر الیٰ اجسامکم ولا الیٰ صورکم ولکن ینظر الیٰ قلوبکم۔ مسلم) گویا صورت اور جسم کی سطح پر جو عمل ہوتا ہے وہ اللہ کا مطلوب عمل نہیں ہے۔ اللہ کا مطلوب عمل وہ ہے جو دل کی سطح پر کیا جائے۔

اگر آپ کو کسی سے محبت ہے تو دیکھئے میں آپ ظاہری اعضاء سے اس سے محبت کرتے ہیں۔ مگر محبت کا واقعہ حقیقۃً دل کے اندر ہوتا ہے نہ کہ زبان کے الفاظ یا ہاتھ پاؤں کی حرکت کی سطح پر۔ یہی حال اسلامی اعمال کا ہے۔ خدا کے یہاں وہی عمل قیمت والا ہے جو دل سے نکلا ہو۔ جو روح کے اندر پیدا ہونے والی ہلچل کا خارجی ظہور ہو۔ جس میں آدمی کی اندرونی ہستی ڈھل گئی ہو۔ اگر آدمی کا عمل محض اوپری عمل ہو، اس کے دل کی دھڑکنیں اس میں شامل نہ ہوئی ہوں تو ایسے عمل کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔

عبادت ظاہری رسموں کا نام نہیں

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز وعظ فرما رہے تھے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک شخص دھوپ میں کھڑا ہوا ہے۔ آپ نے اس کا حال پوچھا۔ بتایا گیا کہ وہ ابو اسرائیل انصاری ہیں۔ انھوں نے روزہ رکھا ہے اور یہ نذر مانی ہے کہ وہ سایہ میں نہ جائیں گے۔ بیٹھے گے نہیں بلکہ کھڑے رہیں گے۔ کسی سے بات چیت نہ کریں گے، خاموش رہیں گے۔ آپ نے فرمایا: ان سے کہو کہ وہ بات چیت کریں، سایہ میں جائیں اور بیٹھیں اور اس طرح اپنے روزے کو پورا کریں (مروہ فلیتکلم ویستظلّ ویقعد ولیتم صومہ، تفسیر قرطبی، بقرہ)

خدا بننے کی کوشش نہ کرو

حمدون قصار نیشاپوری (م ۲۷۱ھ) سے کسی نے پوچھا کہ بندہ کون ہے۔ انھوں نے جواب دیا: "وہ جو عبادت کرے اور یہ نہ چاہے کہ لوگ اس کی عبادت کریں"

عبادت اس طرح نہ کی جائے کہ کسی کو تکلیف ہو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں معتکف تھے۔ آپ نے سنا کہ کچھ لوگ اونچی آواز سے پڑھ رہے ہیں۔ آپ نے اعتکاف کا پردہ اٹھایا اور کہا: دیکھو، تم سب خدا سے مناجات کر رہے ہو، پس ایک شخص دوسرے شخص کو ہرگز تکلیف نہ دے اور قرآن پڑھنے میں ایک دوسرے کے اوپر آواز بلند نہ کرے (اعتکف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی المسجد فسمعھم یجھرون بالقرآن فکشف الستر فقال الا ان کلکم مناج ربہ فلا یؤذینّ بعضکم بعضاً ولا یرفع بعضکم علیٰ بعض فی القرأۃ، ابو داؤد)

برکت والی تقریب وہ ہے جو سادہ تقریب ہو

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے زیادہ برکت والا نکاح وہ ہے جو سب سے کم بوجھ والا ہو (ان اعظم النکاح برکۃ ایسرہ مؤنۃ، رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

ظاہری چیزوں میں شدت برتنا غلط ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا: ھلک المتنطعون ھلک المتنطعون ھلک المتنطعون (ہلاک ہو گئے شدت برتنے والے، ہلاک ہو گئے شدت برتنے والے، ہلاک ہو گئے شدت برتنے والے)

سہولت کا طریقہ اختیار کرو نہ کہ مشقت کا

ایک صحابی کا واقعہ ہے۔ وہ میدان میں تھے۔ نماز کا وقت آگیا۔ انھوں نے گھوڑے کی باگ پکڑے ہوئے نماز پڑھی۔ ایک خارجی نے اس پر اعتراض کیا کہ دیکھو یہ صحابی ہیں اور گھوڑے کی باگ پکڑ کر نماز پڑھ رہے ہیں۔ صحابی نے جواب دیا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ وہ آسانی کو پسند کرتے تھے۔ اگر میں گھوڑے کو چھوڑ دیتا تو وہ بھاگ جاتا۔ میں پیدل چلنے پر قادر نہ تھا۔ مجھ کو خواہ مخواہ پریشانی اٹھانی پڑتی۔

(حدیث نماز کے وقت باگ پکڑنے کے بارے میں نہیں تھی۔ انھوں نے ایک عام حکم سے استنباط کرتے ہوئے ایسا کیا)

غیر ضروری مشقت اٹھانے کا نام نیکی نہیں

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی سفر فرأی رجلاً قد اجتمع الناس علیہ وقد ظُلِّلَ علیہ فقال مالہ قالوا رجل صائمٌ فقال لیس البرّ ان تصوموا فی السفر

(بخاری، مسلم۔ ابوداؤد، نسائی)

جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے۔ آپ نے دیکھا کہ ایک شخص کو لوگ گھیرے ہوئے ہیں۔ اور اس پر سایہ کئے ہوئے ہیں۔ آپ نے پوچھا کیا بات ہے۔ لوگوں نے کہا ایک روزہ دار ہے۔ آپ نے فرمایا کہ سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی نہیں ہے۔

دینی قائد کو عوام کی رعایت کرنی چاہیے

نسائی نے حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت معاذ نے مغرب کی نماز پڑھائی۔ اس میں انھوں نے سورہ بقرہ اور سورہ نساء پڑھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا: اے معاذ، کیا تم لوگوں کو فتنہ میں مبتلا کرنے والے ہو۔ کیا تمھارے لئے یہ کافی نہ تھا کہ تم سورہ طارق اور سورہ شمس جیسی سورتیں پڑھتے (روی النسائی عن جابر بن عبد اللہ قال: صلی معاذ المغرب فقرأ البقرۃ و النساء فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم افتان انت یا معاذ۔ ما کان یکفیک ان تقرأ بالسماء و الطارق والشمس وضحاها ونحوها)

بزرگی کا تعلق دل سے نہ کہ ظاہری اعمال سے

ابوبکر مزنی نے کہا، ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت دوسرے صحابہ پر اس لئے نہیں تھی کہ وہ دوسروں سے زیادہ روزے رکھتے تھے یا دوسروں سے زیادہ نمازیں پڑھتے تھے۔ ان کی یہ فضیلت ایک ایسی چیز کی وجہ سے تھی جو ان کے دل میں تھی۔ ابن علیہ نے ابوبکر مزنی کے اس قول کی وضاحت کرتے ہوئے کہا، ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دل میں جو چیز تھی وہ تھی اللہ کی محبت اور اللہ کے بندوں کے لئے خیر خواہی (قال ابن علیۃ فی قول ابی بکر المزنی: ما فاق ابوبکر رضی اللہ عنہ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم بصوم ولا صلاۃ۔ ولکن بشیٔ کان فی قلبہ۔ قال: الذی کان فی قلبہ الحب للہ عز وجل والنصیحۃ فی خلقہ، جامع العلوم والحکم ۱۷)

دین میں توسع ہے، تنگی نہیں

عن عضیف بن الحارث قال دخلت علی عائشۃ فسألتها فقلت اکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یغتسل من اول اللیل او من آخرہ قالت کل ذلک کان ربما اغتسل من اولہ وربما اغتسل من آخرہ قلت الحمد للہ الذی جعل فی الامر سعۃ

نسائی کتاب الغسل والتیمم ۷۰

عضیف بن حارث رض کہتے ہیں۔ میں عائشہ رض کے یہاں گیا۔ میں نے ان سے پوچھا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کے ابتدائی حصہ میں غسل کرتے تھے یا رات کے آخری حصہ میں۔ عائشہ رض نے جواب دیا سب وقتوں میں۔ آپ کبھی رات کے ابتدائی حصہ میں غسل کرتے اور کبھی رات کے آخری حصہ میں۔ میں نے کہا: شکر ہے اللہ کا جس نے دین میں وسعت رکھی۔

اللہ کا نام لے کر حق کے سوا نہ کہو

حضرت موسیٰ علیہ السلام ساڑھے تین ہزار سال پہلے مصر میں آئے۔ اس وقت بنی اسرائیل (یہود) مصر میں آباد تھے۔ مصر کی مشرک قوموں کے ساتھ رہتے رہتے بنی اسرائیل میں بھی مشرکانہ طریقے سرایت کر گئے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر صحرائے سینا میں لے جاؤ اور وہاں آزادانہ ماحول میں ان کی تعلیم و تربیت کرو۔ قرآن کی ساتویں سورہ (اعراف) میں بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ فرعون کے دربار میں گئے اور اس سے کہا کہ میں رب العالمین کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں۔ لہٰذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے دے۔ اس کے بعد آپ نے اپنی پیغمبری کے ثبوت میں کچھ معجزے دکھائے۔ اس سلسلہ میں قرآن میں بتایا گیا ہے کہ معجزات دیکھنے کے بعد فرعون کے درباری مبہوت ہو گئے۔ انھوں نے کہا: یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تم کو تمھاری زمین سے نکال دے (اعراف ۱۱۰)

اس آیت پر حاشیہ لکھتے ہوئے موجودہ زمانہ کے ایک انقلابی مفسر اپنی تفسیر کی کتاب میں تحریر فرماتے ہیں:

"یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک غلام قوم کا ایک بے سروسامان آدمی یکایک اٹھ کر فرعون جیسے بادشاہ کے دربار میں جا کھڑا ہوتا ہے جو شام سے لیبیا تک اور بحر روم کے سواحل سے حبش تک کے عظیم الشان ملک کا نہ صرف مطلق العنان بادشاہ بلکہ معبود بنا ہوا تھا تو محض اس کے اس فعل سے اتنی بڑی سلطنت کو یہ خطرہ کیسے لاحق ہو جاتا ہے کہ یہ اکیلا انسان سلطنت مصر کا تختہ الٹ دے گا اور شاہی خاندان کو حکمراں طبقہ سمیت ملک کے اقتدار سے بے دخل کر دے گا۔ پھر یہ سیاسی انقلاب کا خطرہ آخر پیدا بھی کیوں ہوا جب کہ اس شخص نے صرف نبوت کا دعویٰ اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ ہی پیش کیا تھا اور کسی قسم کی سیاسی گفتگو سرے سے چھیڑی ہی نہ تھی۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا دعوائے نبوت اپنے اندر خود ہی یہ معنی رکھتا تھا کہ یہ شخص پورے نظام زندگی کو بحیثیت مجموعی تبدیل کرنا چاہتا ہے جس میں لامحالہ ملک کا سیاسی نظام بھی شامل ہے۔ کسی شخص کا اپنے آپ کو رب العالمین کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کرنا لازمی طور پر اس بات کو متضمن ہے کہ وہ انسانوں سے اپنی کلی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے۔ کیونکہ رب العالمین کا نمائندہ کبھی مطیع اور رعیت بن کر رہنے کے لئے نہیں آتا بلکہ مطاع اور راعی بننے ہی کے لئے آیا کرتا ہے اور کسی کافر کے حق حکمرانی کو تسلیم کر لینا اس کی حیثیت رسالت کے قطعاً منافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی زبان سے رسالت کا دعویٰ سنتے ہی فرعون اور اس کے اعیان سلطنت کے سامنے سیاسی و معاشی اور تمدنی انقلاب کا خطرہ نمودار ہو گیا"

تبصرہ

سورۂ اعراف (آیت ۱۰۳ تا ۱۳۴) کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ پوری تفسیر مصنف کا اپنا ذہنی تخیل ہے۔ قرآن کی متعلقہ آیات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

۱۔ اس انقلابی تفسیر کی بنیاد تمام تر صرف فرعون کے درباریوں کے اس مختصر جملہ پر ہے کہ موسیٰ چاہتے ہیں کہ تم کو تمھارے ملک سے نکال دیں (۱۱۰) سوال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی دعوت خود حضرت موسیٰ کی تقریر سے معلوم ہوگی یا آنجناب کے مخالفین کی باتوں سے جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ وہ موسیٰ کی نشانیوں پر ظلم کرتے رہے (۱۰۳) ظلم کے معنی ہوتے ہیں وضع الشئ فی غیر محلہ۔ یعنی انھوں نے حضرت موسیٰ کی باتوں کو اس کے موقع و محل سے ہٹا کر بیان کیا اور ان کو خود ساختہ معنی پہنائے۔

۲۔ فرعون کے دربار میں جس طرح حضرت موسیٰ پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ مصری قوم کو اس کے ملک سے نکال دینا چاہتے ہیں اسی طرح انھوں نے یہ بھی کہا کہ موسیٰ جادوگر ہیں (۱۰۹) وہ زمین میں فساد پیدا کرنا چاہتے ہیں (۱۲۷) مصری قوم پر جو مصیبتیں آرہی ہیں وہ موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست کی وجہ سے آرہی ہیں (۱۳۱) تو کیا یہ سب باتیں بھی محض فرعون اور اس کے درباریوں کے کہنے کی وجہ سے درست مان لی جائیں گی۔

۳۔ قرآن کہتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے فرعون کے سامنے جو مطالبہ پیش کیا وہ یہ تھا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ اس کی طرف سے اپنی پیغمبری کی نشانیاں لے کر آیا ہوں لہٰذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے (۱۰۵) قرآن کی اس واضح نص کے مطابق حضرت موسیٰ اپنی قوم کے ساتھ ملک مصر سے باہر چلے جانا چاہتے تھے۔ پھر جب وہ خود ہی فرعون کے ملک سے نکل رہے تھے تو فرعون کو اس کے ملک سے نکالنے کا سوال کہاں سے پیدا ہو گیا۔

۴۔ فرعون کے درباریوں نے حضرت موسیٰ پر یہ الزام لگایا تھا کہ وہ مصری قوم کو اس کے ملک سے نکال دینا چاہتے ہیں (ان یخرجکم من ارضکم۔ ۱۱۰) اس کے بعد جب جادوگر تائب ہو کر حضرت موسیٰ پر ایمان لائے تو فرعون جادوگروں کے بارے میں بھی یہی الفاظ کہتا ہے کہ یقیناً یہ کوئی خفیہ سازش تھی جو تم لوگوں نے اس شہر میں کی تاکہ تم اس کے باشندوں کو یہاں سے نکال دو (لتخرجوا منھا اھلھا ۱۲۳) اب کیا اس تفسیر کے حامی یہ دعویٰ کریں گے کہ جادوگروں سے مقابلہ پیش آنے سے پہلے حضرت موسیٰ اور جادوگروں نے مل کر یہ خفیہ منصوبہ بنایا تھا کہ "مصر کے دارالسلطنت میں اس کے مالکوں کو اقتدار سے بے دخل کر دیا جائے"۔

۵۔ قرآن کی اگلی آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فرعون اور اس کے ساتھیوں نے مذکورہ بات محض شرارت میں کہی تھی۔ وہ آپ کی دعوت کو سیاسی معنی پہنا کر اپنے لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکا دینا چاہتے تھے جیسا کہ ہر حکمراں اپنے مخالفین کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ چنانچہ فرعون اور اس کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے جب آفتوں میں ڈالا تو اس وقت وہ اپنا شرارت کا کلمہ بھول گئے اور کہہ اٹھے: اے موسیٰ اپنے رب سے دعا کرو۔ اگر وہ ہم پر سے یہ بلائیں ٹال دے تو ہم تمھاری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تمھارے ساتھ مصر کے باہر بھیج دیں گے (لنومنن لک و لنرسلن معک بنی اسرائیل ۱۳۴)

سورہ اعراف کی مذکورہ آیات میں یہ تعلیم ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے سوا نہ کہی جائے (۱۰۵) مگر عجیب بات ہے کہ انھیں آیتوں کو اللہ کا نام لے کر حق کے سوا بات کہنے کا ذریعہ بنا لیا گیا۔

قرآن فہمی

علامہ زمخشری نے لکھا ہے کہ ایک شخص کے سامنے قرآن کی یہ آیت پڑھی گئی:

یَوْمَ نَدْعُوْا کُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ جس دن ہم بلائیں گے تمام آدمیوں کو ان کے مقتدا کے ساتھ۔

اس آدمی نے آیت کا مطلب یہ نکالا: جس دن ہم بلائیں گے سب کو ان کی ماؤں کے ساتھ۔

امام کا لفظ جو مفرد تھا، اس کو اُمّ (ماں) کی جمع سمجھ لیا گیا۔ حالاں کہ وہ شخص اگر قواعد صرف سے واقف ہوتا تو اس کو معلوم ہو جاتا کہ اُمّ کی جمع امام نہیں آتی۔ اسی طرح مثلاً لفظ "مسیح" دو مادوں سے مشتق ہو سکتا ہے۔ اور دونوں کے الگ الگ معنی ہیں۔ اس کا اشتقاق مسح سے ہو تو اس کے معنے چھونے اور تر ہاتھ کسی چیز پر پھیرنے کے ہوں گے۔ اور اگر مساحت سے ہو تو اس کے معنی پیمائش کے ہوں گے، وغیرہ

انھیں وجوہ سے اہل فن نے قرآن کی تفسیر کے لئے پندرہ علوم پر مہارت ضروری بتائی ہے:

۱۔ لغت، جس سے قرآن کے مفرد الفاظ کے معنی معلوم ہو سکیں۔
۲۔ نحو، یعنی اعراب کا علم، کیونکہ عربی زبان میں زبر زیر کے فرق سے معنی بدل جاتے ہیں۔
۳۔ صرف، صیغوں کے اختلاف کو جاننا۔
۴۔ اشتقاق، یعنی کون لفظ کس مادہ سے بنا ہے۔
۵۔ علم معانی، جس سے کلام کی ترکیبیں معنی کے اعتبار سے معلوم ہوتی ہیں۔
۶۔ علم بیان، جس سے کلام کا ظہور و خفا، تشبیہ و کنایہ معلوم ہوتا ہے۔
۷۔ علم بدیع، جس سے کلام کی خوبیاں تعبیر کے اعتبار سے معلوم ہوتی ہیں۔
۸۔ علم قرأت، کیونکہ مختلف قرأتوں کی وجہ سے مختلف معنی معلوم ہوتے ہیں۔
۹۔ علم عقائد، تاکہ یہ معلوم ہو کہ کہاں ظاہر معنی مراد ہیں اور کہاں تاویل کی ضرورت ہے۔
۱۰۔ اصول فقہ، جس سے وجوہ استدلال و استنباط معلوم ہوتے ہیں۔
۱۱۔ اسباب نزول، کیونکہ شان نزول جاننے سے آیت کے معنی زیادہ واضح ہوتے ہیں۔
۱۲۔ علم ناسخ و منسوخ، تاکہ منسوخ شدہ احکام معمول بہا سے ممتاز ہو سکیں۔
۱۳۔ علم فقہ، کیونکہ جزئیات کے احاطہ سے کلیات پہچانے جاتے ہیں۔
۱۴۔ روایات، یعنی وہ تفسیری روایات جو قرآن کی بعض آیات کی تفسیر کرتی ہیں۔
۱۵۔ علم وہبی، وہ علم خاص جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللّٰهُ عِلْمَ مَا لَمْ یَعْلَمْ

بعض لوگوں نے قرآن فہمی کے لئے اس سے کم یا اس سے زیادہ علوم بھی بیان کئے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام

غیر ضروری شرائط ہیں۔ ان کا غیر متعلق ہونا اس سے واضح ہے کہ ان میں سے اکثر علم وہ ہیں جن سے صحابہ بالکل ناواقف تھے، وہ بعد کے دور میں بنائے گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن فہمی کے لئے صرف دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک ایمان، دوسرے عربی زبان۔ اگر آدمی کو فی الواقع ایمانی شعور حاصل ہو اور وہ عربی زبان سے بخوبی واقف ہو تو یقیناً اللہ کی مدد سے وہ کلام الٰہی کو سمجھ لے گا واضح ہو کہ ایمان میں ایمان بالرسالت اور احادیث سے کماحقہ آشنا ہونا بھی لازماً شامل ہے۔

ایمان محض کلمہ کے الفاظ کو دہرانا نہیں ہے۔ ایمان دراصل فطرۃ اللہ کو پالینے کا نام ہے، وہ فطرت جس پر سارے انسانوں کو پیدا کیا گیا ہے۔ ایمان، مجمل شعور کے طور پر، آدمی کو خالق اور مخلوق کے تمام رموز سے آشنا کر دیتا ہے۔ اس کے بعد اگر وہ عربی زبان جانتا ہوا در قرآن کو پڑھے تو وہ اپنے آپ کو ملہم کے مقام پر کھڑا ہوا پاتا ہے۔ اس کو محسوس ہونے لگتا ہے گویا کہ خدا براہ راست اس سے مخاطب ہو گیا ہے۔ اس مقام کو پہنچنے کے بعد انسانی ساخت کے دوسرے علوم قرآن اور بندہ کے درمیان ایک قسم کی رکاوٹ بن جاتے ہیں، کجا کہ وہ قرآن کے معانی کو آدمی کے اوپر کھولنے کا ذریعہ بنیں۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: اور جب میرے بندے میرے متعلق پوچھیں تو بتا دو کہ میں ان سے قریب ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ پس انھیں چاہئے کہ میری پکار پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان رکھیں۔ شاید کہ وہ راہ راست پالیں (بقرہ ۱۸۶) یہ خدا جو ہر وقت ہمارے پاس ہوتا ہے یہی قرآن کا مصنف بھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کا طالب علم ہر وقت اس کے مصنف سے اپنی مشکلات کے بارے میں پوچھ سکتا ہے۔ یہ قرآن کی ایک ایسی انوکھی صفت ہے جو کسی بھی دوسری کتاب کو حاصل نہیں۔

امام ابن تیمیہ ایک انتہائی متبحر عالم تھے۔ ان کا معمول تھا کہ جب قرآن کی کسی آیت کا مضمون ان پر نہ کھلتا تو وہ کسی سنسان مسجد میں چلے جاتے۔ وہاں وضو کر کے نماز پڑھتے اور سجدہ میں گر کر دعا کرتے: یا معلّمَ ابراھیم علمنی (اے ابراہیمؑ کو بتانے والے مجھے بھی بتا دے) اس طرح کے واقعات دوسرے علماء کے بارے میں بھی مختلف شکلوں میں کتابوں میں آئے ہیں۔

کسی کتاب کو سمجھنے کی سب سے اہم شرط یہ ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کا مزاج مصنف کے مزاج سے مل جائے۔ مزاج میں جتنی زیادہ دوری ہوگی، کتاب کو سمجھنے میں اتنی ہی مشکل پیش آئے گی۔ یہی معاملہ قرآن کا بھی ہے۔ قرآن سمجھنے کے لئے سب سے زیادہ ضروری شرط یہ ہے کہ آدمی اس حد تک اپنے کو خالص کرے کہ اس کا فکر خداوندی فکر سے ہم آہنگ ہو جائے۔ یہ ہم آہنگی آدمی کو جتنا زیادہ حاصل ہوگی اتنا ہی زیادہ وہ خدا کی کتاب کو سمجھنے میں کامیاب ہوگا۔ قرآن کو پانے والا وہ ہے جو خود خدا کو پالے۔ خدا کو پائے بغیر کوئی شخص قرآن کو نہیں پا سکتا۔ جو شخص اپنے آپ کو خدا میں ملا دیتا ہے خدا اس کا معلم بن جاتا ہے جس سے وہ سوال کرے اور اپنے سوال کا جواب پائے۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

۱۔	الاسلام		از مولانا وحید الدین خاں		۱۵—۰
۲۔	مذہب اور جدید چیلنج	..	//	..	۱۵—۰
۳۔	ظہور اسلام	..	//	..	۱۵—۰
۴۔	دین کیا ہے	..	//	..	۲۱—۰
۵۔	قرآن کا مطلوب انسان	..	//	..	۵—۰
۶۔	تجدید دین	..	//	..	۳—۰
۷۔	اسلام دین فطرت	..	//	..	۳—۰
۸۔	تعمیر ملت	..	//	..	۲—۰
۹۔	تاریخ کا سبق	..	//	..	۳—۰
۱۰۔	مذہب اور سائنس	..	//	..	۵—۰
۱۱۔	عقلیات اسلام	..	//	..	۳—۰
۱۲۔	فسادات کا مسئلہ	..	//	..	۲—۰
۱۳۔	انسان اپنے کو پہچان	..	//	..	۱—۰
۱۴۔	تعارف اسلام	..	//	..	۲—۵۰
۱۵۔	اسلام پندرھویں صدی میں	..	//	..	۲—۰
۱۶۔	راہیں بند نہیں	..	//	..	۳—۰
۱۷۔	دینی تعلیم	..	//	..	۳—۰
۱۸۔	ایمانی طاقت	..	//	..	(زیر طبع)
۱۹۔	اتحاد ملت	..	//	..	
۲۰۔	سبق آموز واقعات	..	//	..	
۲۱۔	اسلامی تاریخ سے	..	//	..	
۲۲۔	قال اللہ	..	//	..	
۲۳۔	اسلامی دعوت	..	//	..	۳—۰۰
۲۴۔	زلزلۂ قیامت	..	//	..	۴—۰۰
۲۵۔	سچا راستہ	..	//	..	۱—۰۰

A Reliable And Genuine

House Of

All Kinds of Tin, Tin Sheet,

Tin-Plate, Iron Sheet

& Iron Scrap

HIND TIN STORE

1596/98, Nalla Sadar Bazar, Delhi-6

Tel. (Off)-511510, Resi-502267

REGD. NO. D. (DN) 532
REGD. R. N. NO. 28822/76

JUNE 1981
ISSUE NO. 55

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

۷۰ سال سے
لوگوں کا من پسند
شربت

شربت رُوح افزا ۷۰ سالوں سے لوگوں کو گرمی کے
دنوں میں ٹھنڈک اور تراوٹ پہنچاتا آرہا ہے۔
یہ بدن کو قدرتی تازگی دینے والی سولہ جڑی بوٹیوں
اور پھولوں پھلوں کے خالص رس سے بنتا ہے۔
شربت رُوح افزا پیاس ہی نہیں بجھاتا بلکہ
آپ کے جسم کو گرمی کا
مقابلہ کرنے کی طاقت دیتا ہے۔
اِسے آپ چینی کی جگہ ٹھنڈے پانی،
دودھ یا دہی کی لسی اور آئس کریم میں ڈالیے اور
بھرپور فرحت بخش لذت حاصل کیجیے۔

شربت رُوح افزا
لاجواب چیز ہے

ہمدرد

HTD-HWL-6741